"جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اردو زبان و ادب کے کتنے گوشے توجہ کے مستحق ہیں، تو مجھے اپنا یہ سارا کام بہت حقیر معلوم ہوتا ہے، میں نے اندھیرے میں مٹی کا ایک چھوٹا سا دیا جلانے کی کوشش کی ہے"۔ یہ اگر حقیقت بھی ہو تو یہ بھی سچ ہے کہ اس دیے کی روشنی دور دور تک پہنچی ہے۔ (ش۔ د)

مکاتیب ریاضیہ :۔ مرتبہ جناب ظفر کمالی صاحب۔ تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۱۶، قیمت ۳۰ روپے پتے۔ (۱) مدرسہ عربیہ سراج العلوم تلہٹہ بازار سیوان۔ (۲) بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ ۴۔

مولانا ریاض احمد صاحب مرحوم ضلع چمپارن کے ایک صاحبِ درس و ارشاد بزرگ تھے، ان کے علاقے کے لوگوں کو ان کی ذات سے بڑا فیض پہنچا، درس و تدریس اور ارشاد و ہدایت کی مشغولیتوں کی وجہ سے انھیں تصنیف و تالیف کا موقع نہیں ملا، مگر انھوں نے اپنے تلامذہ و مسترشدین کو جو اصلاحی و تربیتی خطوط لکھے تھے اب مولانا کے قدر دانوں نے ان کا یہ منتخب مجموعہ عام فائدہ کے لیے شائع کیا ہے، ان مکاتیب میں تصوف و سلوک کے نکات اور اصلاح باطن کے زریں مشورے دیے گئے ہیں، شروع میں مختلف ارباب قلم نے مولانا مرحوم کے حالات و کمالات اور مکاتیب کی خصوصیات تحریر کی ہیں، اور آخر میں جناب وارث ریاضی کا منظوم خراج عقیدت درج ہے، اس سے اور مولانا پر لکھے گئے مضامین سے ان کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

نغمات اسلام :۔ از جناب ابوسلیم عبدالعلیم آہبر، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۰۸، قیمت ۳ روپے پتہ سلیم بکڈپو سمرا، پوسٹ سمری خانکوٹ، ضلع بستی، یو۔ پی

مولوی ابوسلیم عبدالعلیم آہبر بستوی کو شعر و سخن سے مناسبت ہے، یہ ان کی دینی و مذہبی نظموں کا مجموعہ ہے جس کے کئی اڈیشن نکل چکے ہیں، ابتدا میں حمد و نعت سے متعلق اور آخر میں دوسرے دینی، قومی، اصلاحی اور اخلاقی موضوع پر نظمیں ہیں، ان سب سے مصنف کے سنجیدہ ذوق اور دینی و اسلامی جذبہ کا اندازہ ہوتا ہے، ان کو اپنی مشق و ریاض جاری رکھنی چاہئے تاکہ کلام میں مزید پختگی اور جلا پیدا ہو۔ "ض"

جلد ۱۴۱ ماہ جمادی الثانی ۱۴۰۸ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۸۸ء عدد ۲

مضامین

شذرات — ضیاء الدین اصلاحی — ۸۲ – ۸۴

مقالات

اندلس کا اسلامی تمدن مستشرقین کی نظر میں — ڈاکٹر مصطفیٰ الشکعۃ صدر دراسات علیا (بحث علمی جامعہ امارات عربیہ) (ترجمہ محمد عارف اعظمی عمری رفیق دارالمصنفین) — ۸۵ – ۱۰۶
دارا شکوہ کے خواب — ڈاکٹر عبدالرب عرفان۔ ناگپور۔ — ۱۰۷ – ۱۲۷
سید صباح الدین عبدالرحمٰن — ڈاکٹر عبدالمغنی۔ پٹنہ — ۱۲۸ – ۱۳۲
جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کی وفات پر تعزیتی تار، تجاویز اور خطوط — .. .. .. — ۱۳۳ – ۱۵۶
مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۱۵۷ – ۱۶۰

شذرات

خان عبدالغفار خاں کی موت سے پورا ملک گہرے رنج وغم میں ڈوب گیا، وہ ہندوستان کے ان عظیم لیڈروں کی آخری یادگار تھے، جنھوں نے قوم کی بے لوث خدمت اور وطن کی آزادی کیلئے اپنے سروں پہ کفن باندھ لئے تھے، انکی پوری زندگی خدمت، جدوجہد، خلوص، جوش عمل، سرگرمی، ایثار، قربانی، سرفروشی، استقامت اور نوع انسانی سے محبت وہمدردی کا ایک نمونہ تھی، وہ ہمیشہ امن وآشتی اور عدم تشدد کے علمبردار رہے، اور فرقہ واریت اور تنگ نظری کے خلاف ہمت، جرأت، اولوالعزمی اور بہادری سے لڑتے رہے۔

ان کے والد بہرام خاں پشاور کے ایک گاؤں اتمان زئی کے خوشحال زمیندار تھے، خان عبدالغفار خاں کا بچپن ناز ونعم میں بسر ہوا، ابتدائی تعلیم پشاور کے ایک مشنری اسکول میں ہوئی، ایک سال کیلئے علی گڑھ بھی آئے، یہاں سے واپس ہوکر انھوں نے تعلیمی حیثیت سے اپنے پس ماندہ علاقے میں آزاد قومی اسکول قائم کرنے کی مہم شروع کی، اسی اثنا میں مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار الہلال اور دوسرے قوم پرور اخبارات زمیندار (لاہور) اور مدینہ (بجنور) نے انکا رخ قومی وسیاسی سرگرمیوں کی جانب موڑ دیا، شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ سے بھی انکا رابطہ رہا، اور وہ ریشمی رومال تحریک میں بھی شامل ہوئے، ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف ملک گیر تحریک شروع کی، خان عبدالغفار خاں نے بھی اپنے وطن کے ایک جلسۂ عام میں ایکٹ کی مذمت کا رزولیشن منظور کیا، اس جلسہ میں نوے برس کے انکے بوڑھے باپ بھی شریک تھے، سنہ ۱۹۲۰ء میں وہ دہلی کی آل انڈیا خلافت کانفرنس میں شریک ہوئے جس میں ایک پرجوش نوجوان نے ہجرت کی تجویز پیش کی تھی، اسکے نتیجہ میں اٹھارہ ہزار پختون کابل چلے گئے، اور یہ بھی ایک بڑی جماعت لے کر گئے۔

پختونوں کی مذہبی ومعاشرتی اصلاح کے لیے پہلے انجمن اصلاح الافاغنہ کی تشکیل کی پھر خدائی خدمت گار تنظیم اور افغان جرگہ قائم کیا، ان تحریکوں سے قبائلیوں میں سیاسی بیداری بھی پیدا ہوئی اور پشتو زبان

وادب کی ترقی بھی ہوئی، خدائی خدمت گار تنظیم کو پہلے سول نافرمانی کی تحریک سے وابستہ کیا اور پھر اسے کانگریس کی ایک رضاکار شاخ بنادیا، ۱۹۳۱ء میں وہ گاندھی اروِن معاہدے کے تحت گجرات جیل سے رہا ہونے کے بعد کانگریس کے سرگرم کارکن ہوگئے تھے، اسی سال وہ پہلی بار گاندھی جی سے ملے، اس کے بعد ان سے اتنا تعلق بڑھا کہ یہ خود سرحدی گاندھی کہلانے لگے، ہشت نگر کے پختونوں نے خان عبدالغفار خاں کی بے لوث خدمت کی وجہ سے ایک دن مسجد کے پاس جمع ہوکر انھیں اپنا بادشاہ بنالیا، گاندھی جی بھی انھیں شفقت سے بادشاہ خاں کہنے لگے، پھر یہی نام بچے بچے کی زبان پر چڑھ گیا، وہ واقعی پٹھانوں کے بے تاج کے بادشاہ تھے، انھوں نے سرحد کے پٹھانوں جیسے تشدد پسند لوگوں کو امن وعدم تشدد کا خوگر بنادیا، ۱۹۳۴ء میں انھیں کانگریس کی صدارت پیش کی گئی، تو یہ کہکر اسے رد کردیا کہ "میں سپاہی ہوں اور سپاہی ہی کی طرح مرنا چاہتا ہوں"۔

خان عبدالغفار خاں متعدد بار جیل گئے، اور انھوں نے جلاوطنی کی زندگی بھی گذاری، آزادی سے پہلے وہ پندرہ برس جیل میں رہے اور آزادی کے بعد بھی اتنا ہی عرصہ جیل میں گذارا، مگر نہ کبھی ان کے عزم وارادہ میں کوئی تبدیلی آئی اور نہ ملک کی تقسیم اور دو قومی نظریے کو ماننے کے لیے وہ تیار ہوئے، اس بارے میں خود کانگریس کے سرکردہ لیڈروں سے ان کا اختلاف رہا، آزادی کے بعد معمولی درجہ کے لیڈر بھی مسند اقتدار پر فائز ہوتے رہے، مگر یہ خدائی خدمت گار اور صف اول کا مجاہد آزادی جیل کی صعوبتیں برداشت کرتا رہا، وہ چاہتا تو اسے ہر قسم کا عیش وآرام مل جاتا، مگر وہ اپنے اصولوں پر اٹل رہا اور جن لوگوں کے ساتھ اس نے زندگی گذاری تھی انھیں بے یار ومددگار چھوڑنا گوارا نہ کیا، آزادی کے بعد وہ چار بار ہندوستان آئے اور ہر بار ان کا نہایت پرجوش خیر مقدم کیا گیا، پہلے "نہرو امن ایوارڈ" اور پھر ملک کا سب سے بڑا اعزاز "بھارت رتن" دیا گیا، مگر یہ قدرومنزلت دیکھ کر بھی ان کے دل میں یہاں مستقل رہائش کا خیال نہ ہوا بلکہ وہ ملک میں تشدد، فرقہ پرستی، علاقائیت اور انتشار کے بڑھتے ہوئے رجحان کے خلاف احتجاج ہی کرتے رہے، کاش انکی آؤ بھگت کرنے والے انکے اصولوں کی بھی قدر کرتے، وہ بڑے سچے اور پکے مسلمان تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

مولانا محمد ہاشم میاں فرنگی محلی کی وفات ایک بڑا المناک سانحہ ہے، وہ ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے اور اکہتر برس کی عمر میں

۱۴ فروری کو اللہ کو پیارے ہوگئے، فرنگی محل لکھنؤ کے ممتاز علمی و دینی خانوادے سے انکا تعلق تھا، وہ مولانا صبغۃ اللہ فرنگی محلی کے فرزند اکبر تھے جو عربی ادب میں مہارت اور اپنی لطافت آمیز تحریر و تقریر کے لیے مشہور تھے، یہ خصوصیت مولانا ہاشم میاں کو بھی ان سے وراثتاً ملی تھی، وہ بھی اچھے واعظ و خطیب تھے، اور انکی تقریریں لطافت و ظرافت اور انکے مخصوص انداز کی وجہ سے بہت دلنشین ہوتیں اور پسند کی جاتیں، بڑے خوش پوش جامہ زیب لکھنؤ کی قدیم روایت و تہذیب اور اپنی خاندانی وضعداری اور شرافت کا نمونہ تھے، وہ بہت باغ و بہار شخص تھے، انکی بذلہ سنجی، خوش طبعی اور خوش گفتاری مشہور تھی۔

مولانا محمد ہاشم لکھنؤ کے مختلف مذہبی، علمی اور تعلیمی اداروں سے وابستہ تھے، دینی تعلیم اور اردو کے فروغ کے لیے غیر معمولی جد و جہد کی، شروع ہی سے اترپردیش دینی تعلیمی کونسل کے اہم رکن تھے، مسلم پرسنل لا بورڈ کے بھی ممبر تھے، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے، ایک زمانہ میں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم کے ساتھ ملکر بابو ترلوکی سنگھ کی پرجا سوشلسٹ پارٹی کو بڑی مدد پہنچائی، مگر جلد ہی اس میدان سے کنارہ کش ہوگئے، وہ اپنی نیکی، شرافت، تواضع، خوش خلقی اور وسعت قلبی کی وجہ سے نہ صرف مسلمانوں کے ہر طبقہ و جماعت بلکہ غیر مسلموں میں بھی مقبول تھے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔

افسوس ہے کہ ۲ فروری کو دارالمصنفین کے ایک قدیم رکن مرزا نیاز احمد بیگ بھی رحلت فرماگئے، وہ اعظم گڈھ کے ممتاز اور کامیاب وکیل اور شہر کے عمائد میں تھے، مولانا شبلیؒ اور ان سے نسبت رکھنے والے تمام اداروں سے ان کو بڑا تعلق تھا، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کی مجلس انتظامیہ کے برسوں رکن اور نائب صدر رہے، اب انکی تمام تر توجہ دارالمصنفین کی طرف مرکوز ہوگئی تھی، جسکی مجلس انتظامیہ کے وہ آخر دم تک رکن رہے، دارالمصنفین کے نازک اور بحرانی دور میں ان کے مفید قانونی مشوروں سے اسکو بڑا فائدہ پہنچا، اب وہ اپنے ایک سچے بہی خواہ اور مخلص ہمدرد سے محروم ہوگیا، وہ صوم و صلوۃ کے ہمیشہ سے پابند رہے، حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے، آخر عمر میں ان کی دینداری زیادہ بڑھ گئی تھی، علماء و صلحاء سے بھی تعلق رکھتے تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے خاص عقیدت تھی، اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں سے درگذر فرمائے، اور انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

مقالات

اندلس کا اسلامی تمدّن مستشرقین کی نظر میں

از ڈاکٹر مصطفی الشکعۃ صدر دراسات علیا و بحث علمی جامعہ امارات عربیہ

ترجمہ :۔ محمد عارف اعظمی عمری، رفیق دارالمصنفین

(۲)

پروفیسر ڈوزی اس بات پر بھی اپنے افسوس اور تاسف کا اظہار کرتے ہیں کہ مرابطین کے عہد میں عربی شاعری میں بھی انحطاط آگیا تھا، وہ لکھتے ہیں :

"اس عہد میں عربی اشعار طاقت و قوت اور زور و اثر کھو چکے تھے، کیونکہ ان میں لطف و تفریح کا سامان نہ ہوتا تھا، اور وہ بے فکری اور آزادہ روی سے خالی ہوتے تھے، اور بزدلی، دون ہمتی اور غم و اندوہ کے جذبات پر مشتمل ہوتے تھے، نیز ان میں دینی رجحانات کی عکاسی زیادہ ہونے لگی تھی[۱]"۔

پروفیسر ڈوزی جیسے عظیم محقق کے خیال میں اشعار کا ہلکا پھلکا ہونا اور لہو و لعب پر مبنی ہونا اس کے طاقتور اور موثر ہونے کی دلیل ہے، یہ عناصر چونکہ ملوک طوائف کے دور کی شاعری میں موجود تھے اس لیے وہ اس عہد کی شاعری کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، اس کے برعکس

---

[۱] تاریخ الفکر الاندلسی ص ۲۰۔

اشعار میں کرب و بے چینی اور دین داری کا اظہار ان کے نزدیک عیب کی بات ہے، یہ خصوصیات مرابطین کے عہد کی شاعری میں پائی جاتی ہیں، اس وجہ سے وہ مرابطین کو اپنی تنقیدوں کا نشانہ بناتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ پروفیسر ڈوزی کی نگاہ میں ملوک طوائف کا دور صرف اس وجہ سے پسندیدہ ہے کہ وہ سیاسی اعتبار سے کمزور اور بے وزن تھا، اس زمانہ کے حکمرانوں میں باہم خانہ جنگی بھی ہوتی رہتی تھی، اس لیے وہ ایک دوسرے کے خلاف فرنگیوں سے مدد کے طالب ہوتے تھے، اس کی وجہ سے ملک کی حالت ابتر تھی، اور اندلس میں امت مسلمہ زبردست اضطراب و انتشار کا شکار تھی، اس کے برخلاف مرابطین سے پروفیسر ڈوزی کی ناراضگی کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس انتشار کو ختم کر کے ملک میں امن و امان قائم کرنے اور مسلمانوں کو متحد و منظم کرنے کی کوشش کی، ان کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ ملوک طوائف کے دور کے استبداد سے اندلس کے مسلمانوں کو آزاد کرایا، اور اسلام دشمن مسیحی فوجوں کو شکست دی۔

ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کی عقل و قیاس اور تاریخ کے غیر جانبدارانہ مطالعہ سے بھی تائید ہوتی ہے، علاوہ ازیں خود کئی ہسپانوی مستشرقین نے بھی پروفیسر ڈوزی کی تردید کی ہے، اور اس سلسلہ میں ان کے خیالات پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے ان کے اس دعوی کو غلط اور مہمل قرار دیا ہے، مشہور ہسپانوی مستشرق جارثیا جومس ملوک طوائف کے دور کے حکمرانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "یہ سب دو طرف سے اپنے دشمنوں کے نرغہ میں تھے، ان کے شمال میں مسیحی اور جنوب میں بربر تھے، اور خود وہ بہت کمزور اور بے بس تھے، اس کی وجہ نازع البالی اور خود مختاری تھی، وہ مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گئے تھے، اور ان کا حال یہ تھا کہ کسی بھی ریاست کا حکمراں اپنی سرحد سے باہر قدم نکالنے کی جرأت نہ کرتا تھا، ان کی ریاستوں کا حال اٹلی کے مشرقی حصے کی

سلطنتوں سے مشابہ تھا، در اصل یہ جھوٹی شان و شوکت، بے جا اسراف، قتل و خوں ریزی اور تباہی و بربادی کا دور تھا۔"[1]

مستشرق آنخل جنثالث پالنثیا بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اندلس میں مسلمانوں کا اقتدار ملوک طوائف کے دور میں کمزور ہوا، اسی زمانہ میں یہ ملک صحیح معنوں میں مسلمانوں کے قبضہ سے نکلا، کیونکہ یہ حکمراں شدید باہمی اختلافات میں مبتلا تھے، اور ریاستوں میں بٹے ہوئے تھے، اس کی وجہ سے وہ کسی بھی طرح ان عیسائیوں کے مقابلہ کے لائق نہیں رہ گئے تھے، جو مکمل طور پر متحد و منظم تھے، ۴۷۸ھ میں الفونش ششم نے جب طلیطلہ پر قبضہ کر لیا تو اس کو ایک مرکز ہاتھ آ گیا جہاں سے وہ ان کے باہمی نزاع کے وقت ایک دوسرے کی معاونت کرتا تھا، پھر وہ ریاست بلنسیہ کے انتظامی امور میں کافی دخیل ہو گیا، رفتہ رفتہ اس کی طاقت اس قدر بڑھ گئی کہ مسلمان اس سے خطرہ محسوس کرنے لگے، بادشاہ المعتمد نے محض اس کے خوف کی بنا پر اس کو اپنا حلیف بنا لیا، اور اس سے اپنی ایک لڑکی کی شادی کر دی، ...... ایسے نازک وقت میں جب فقہائے اسلام نے دیکھا کہ اندلس میں اسلام کا دائرۂ اثر دن بہ دن کم ہوتا جا رہا ہے تو انھوں نے مرابطین کے سرگروہ یوسف بن تاشفین کا رخ کیا، تاکہ اس سے اندلس کے حالات بیان کریں، وہ جانتے تھے کہ یوسف بن تاشفین اندلس کے حکمرانوں کو پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتا ہے، مگر اس کے باوجود بطلیوس اور غرناطہ کے قاضیوں پر مشتمل ایک وفد یوسف بن تاشفین کی خدمت میں افریقہ پہونچا جس میں مشہور اندلسی شاعر ابو الولید زیدون کا ایک وزیر لڑکا ابوبکر بھی تھا، ان لوگوں نے اس سے عیسائیوں کے مظالم کی شکایت کی، یوسف بن تاشفین نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور ان کی درخواست پر لگاتار تین مرتبہ سمندر عبور کر کے اندلس میں الفونش پر حملہ کیا جس میں الفونش اور اس کے اتحادیوں کو زبردست شکست ہوئی، ان حملوں کے دوران

---

[1] تاریخ الفکر الاندلسی، ص ۷۷ - ۷۸۔

یوسف بن تاشفین نے اندلس کے مختلف قبیلوں کو متحد اور منظم کرنے کی بھی کوشش کی، فقہائے اسلام کو جب یہ اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ اندلس پر یہ ساری مصیبت ان ہی حکمرانوں کی وجہ سے آئی ہے، کیونکہ یہ پراگندہ اور منتشر ہیں، اور نصرانی افواج کے مقابلہ کی ان میں ہمت نہیں ہے، تو انھوں نے یہ فتویٰ صادر کردیا کہ یہ بادشاہ معزول کردیے جائیں[1]، چنانچہ اسی کے بعد سے اندلس میں یوسف بن تاشفین کی قیادت میں ایک پُرشوکت اور باعزت اسلامی دور کا آغاز ہوا، اور رفتہ رفتہ پورا اندلس اور شمالی افریقہ کا ایک بڑا حصہ اسلامی حکومت کے زیر سایہ آگیا،

یہ اندلس کے دو عظیم مستشرقین کے خیالات ہیں جو ہمارے خیال میں پروفیسر ڈوزی کی باتوں کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں، البتہ انھوں نے یوسف بن تاشفین پر جو یہ اعتراض عائد کیا ہے کہ وہ کم عقل تھے، اس پر گفتگو کرنی ابھی باقی ہے، کیا واقعۃً یوسف بن تاشفین کم عقل تھے؟ اگر یہ بات غلط ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسے شخص کے لیے جو علم کا مدعی بھی ہو اور مستشرقین کے اعلیٰ طبقہ میں اس کا شمار بھی ہوتا ہو یہ بات مناسب ہے کہ تاریخ نویسی میں وہ بدگوئی اور بدکلامی کو اپنا شیوہ بنائے،

کیا ایسے شخص کو کم عقل کہا جاسکتا ہے جس سے ملوک طوائف کے دور کے لاپرواہ اور بدبخت حکمراں خود مدد کے طلبگار ہوں اور وہ مراکش سے اپنی فوجیں لاکر اندلس میں حملہ آور ہوجائے اور قدم قدم پر ہر میدان میں مسیحی افواج کو پسپا کرتا چلا جائے، یوسف بن تاشفین کی قیادت میں جو جنگیں ہوئیں ان میں سب سے مشہور جنگ زلاقہ ہے، جو ۴۷۹ھ میں ہوئی تھی، اس جنگ میں حکمران المعتمد بن عباد جو بلند پایہ شاعر بھی تھا بہ نفس نفیس ایک فوجی کی حیثیت سے شریک ہوا تھا۔

کیا وہ شخص کم عقل کہے جانے کا مستحق ہے جس کے ہاتھ پر اس دور کے تیرہ[13] بادشاہوں نے خود

۱؎ تاریخ الفکر الاندلسی ص ۱۷ - ۱۸ .

آگے بڑھ کر بیعت کیا تھا، اور اس کو امیر المسلمین کا لقب دیا تھا، حالانکہ اس سے قبل وہ صرف ایک سردار کی حیثیت سے معروف تھا۔

یوسف بن تاشفین اندلس پر اپنے حملوں کے بعد مراکش لوٹ آیا، مگر اندلس سے وہ غافل نہ رہا، چنانچہ اس نے اپنی فوجوں کو پھر تیار کرکے اسی سال براہ راست غرناطہ پر فوج کشی کی، اس وقت غرناطہ میں صنہاجیوں کا آخری بادشاہ عبداللہ ابن بلکین تخت نشین تھا، رفتہ رفتہ اندلس کے تمام شہر اس کے ہاتھوں فتح ہوتے گئے، اور اس کی حکومت کا دائرہ جزیرۂ اندلس کے علاوہ مراکش کے وسط بلکہ اس کے آخری حصوں تک پھیل گیا، کیا ایسا عظیم بادشاہ کم عقل ہوسکتا ہے؟ صحیح بات یہ ہے کہ پروفیسر ڈوزی اس بلند اوصاف و کمالات کے مالک بادشاہ کی شخصیت کو مجروح کرنے میں تو بالکل ناکام رہے ہیں مگر اس کوشش کے نتیجہ میں انھوں نے خود اپنی ذات کو ضرور مجروح کرلیا ہے، تمام انصاف پسند مورخین یوسف بن تاشفین کا وصف یوں بیان کرتے ہیں:

كان حازمًا ضابطًا للنفس ماضى العزيمة أسمر اللون، رقيق الصوت۔

وہ بہت ہوشیار، متحمل مزاج اور بلند ہمت تھا، اس کا بدن گندمی رنگ کا تھا، اور آواز نرم تھی۔

شاید پروفیسر ڈوزی کو یوسف بن تاشفین کی جو بات زیادہ بری لگی ہے اور جس کی بنا پر وہ غصہ میں اپنا توازن کھو بیٹھے ہیں، وہ یہ ہے کہ اس عظیم الشان بادشاہ نے اپنے عہد کے رائج سکوں پر کلمہ طیبہ اور قرآن مجید کی یہ آیت کندہ کرائی تھی:

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔ (آل عمران)

اور جس نے اسلام کے علاوہ کوئی دین چاہا، وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوگا۔

پروفیسر ڈوزی جیسے بے دین اور معاند اسلام شخص کو یہ طریقہ پسند نہ آیا، اور اس لیے چراغ پا ہو کر یہ انداز و اسلوب اختیار کیا۔

پروفیسر ڈوزی مرابطین کے دور کو فکری و ادبی حیثیت سے پس ماندہ بتاتے ہیں، ہم اس کی تردید کے لیے مستشرق پالنثیا کے حوالے سے ان کے استاد جولیان ریبیرا کے خیالات نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں، انھوں نے مشہور زجل گو ابن قزمان پر ایک مفصل مضمون لکھا ہے، اس میں لکھتے ہیں:

"مرابطین کے عہد کے بارے میں لوگوں میں ایک عام خیال یہ پیدا ہو گیا جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے، کہ یہ عہد فلسفہ دشمنی اور ظلم و بربریت کا دور تھا، جبکہ مشہور شاعر ابن قزمان کا تعلق اسی عہد سے ہے، جس کے اشعار میں تر و تازگی، جدت و ابتکار اور معاشرے کے ہر طبقہ کی تصویر کشی کی گئی ہے، اور ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت پورا معاشرہ خود پسند اور اپنی ادبی روایتوں پر نازاں تھا۔"

اسی مضمون میں ریبیرا یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

"ہسپانوی تاریخ میں مشکل ہی سے کوئی ایسا دور مل سکتا ہے جس میں اس درجہ کے بلند پایہ مفکرین، شعراء، ادباء اور اہل علم پیدا ہوئے ہوں، گو اس عہد میں ہسپانوی باشندوں نے اپنی سیاسی اور دفاعی سربراہی افریقہ کے مرابطین کے ہاتھوں میں دے دی تھی، مگر اس عہد میں بھی اندلسی ہی یورپ کی وہ واحد قوم تھے جن کی آغوش میں علوم و آداب اور فکر و فلسفہ وغیرہ کی نشو و نما ہوئی، یہ قوم اس دور میں بھی مرجع خلائق تھی، علم و معرفت کے شیدائی فکر و فلسفہ اور تہذیب و تمدن کی طلب میں وہیں کا رخ کرتے تھے، بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں جب یورپ نے علم و فن، فلسفہ و منطق اور ادب کے میدانوں میں ترقی شروع کی، اس وقت اندلسی قوم ہی فلسفہ، علم الفلک، طب، ناول و افسانہ اور شاعری وغیرہ میں یورپ کی تمام قوموں میں سب سے

زیادہ سرمائے کی حامل تھی"[1]

مستشرق پالنثیا نے اپنے استاد جولیان ریبیرا کی یہ عبارت جو پروفیسر ڈوزی کے اعتراضات کی مکمل تردید کرتی ہے، نہایت تفصیل سے مدلل طور پر نقل کی ہے، اور یہ ثابت کیا ہے کہ ادب کے جملہ فنون نے مرابطین ہی کے عہد میں ترقی کے اعلیٰ منازل طے کیے ہیں، اس کے ثبوت میں انھوں نے اس عہد کے اہم اور ممتاز اشخاص کے نام بھی گنائے ہیں، جیسے فن نقد و تبصرہ میں فتح بن خاقان اور ابن بسام، فن تاریخ میں ابن بشکوال اور ضبی، تذکرہ و تراجم میں ابن جبیر، علم جغرافیہ میں ابو حامد غرناطی اور ادریسی، فلسفہ میں ابن باجہ، ریاضی میں ابن مسعود، ابن سہل نابینا اور جبیر ابن افلح اشبیلی، طب میں ابو الصلت، الدانی، ابن باجہ، اس کا معاون سفیان اندلسی اور خاندان زہرہ کے ابو مروان اور ابو العلاء، فقہ میں ابن ابی الخصال اور قاضی عیاض، علوم حدیث میں رشاطی اور قاضی عیاض، اور علوم دینیہ میں ابوبکر بن العربی۔

عہد مرابطین کے یہ چند نام ہی اس دور کے علمی و فنی عروج کی ضمانت ہیں، ان سب نے اپنے علمی کارناموں، فکری کاوشوں اور اپنی گراں قدر کتابوں کے ذریعہ اپنی قوم کی علمی و فکری نشو و نما میں نہایت اہم حصہ لیا ہے۔

پالنثیا کی اس فہرست میں مزید کچھ ناموں کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے، جیسے اس عہد کے شعراء میں ابن حمدیس الصقلی، جو معتمد بن عباد کا درباری شاعر تھا، معتمد جب جلا وطن ہو کر اغمات آیا تو یہ بھی اس کے ساتھ تھا، پھر یہ مرابطین کے شعراء میں شمار کیا جانے لگا، اسی طرح ابن عبدون، ابو بکر عبد العزیز بن قبطورنہ اور محمد بن عبد اللہ شنتریني بھی اسی عہد کے ممتاز شعراء میں تھے، ابن عبدون اور ابن قبطورنہ بنو افطس کے درباری شاعر تھے، بعد میں مرابطین سے ان کا تعلق ہو گیا، ابن خفاجہ اور

[1] تاریخ الفکر الاندلسی ص ۲۱-۲۲، بحوالہ مقالہ ریبیرا بر ابن قزمان۔

ابن زقاق بھی اسی عہد کے نامور شاعر تھے جو منظر نگاری میں خاص امتیاز رکھتے تھے، ابی الصلت امیہ ابن عبدالعزیز کو بھی اس فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے، گو ان کا بڑا وقت مشرقی ملکوں کی سیاحت میں گذرا۔

اس عہد کے مورخین میں ابو بکر یحییٰ بن محمد المعروف بہ ابن الصیرفی بھی ہیں، جو "اخبار لمتونہ" کے مصنف اور ابو حامد بن تاشفین کے درباری کاتب بھی تھے، الیسع بن عیسیٰ بن حزم الغافقی، مصنف "فضائل اہل المغرب" اور "المغرب فی محاسن المغرب" کا بھی تعلق اسی عہد سے رہا ہے موخر الذکر کتاب انھوں نے ۵۶۰ھ میں اپنے قیام مصر کے دوران لکھی تھی، اور اس کو سلطان صلاح الدین ایوبی کی خدمت میں پیش کیا تھا، اس عہد کے مورخین میں ابو عامر محمد بن یحییٰ بن نیق بھی ہیں، جو "کتاب فی ملوک الاندلس والاعیان والشعراء بہا" کے مصنف ہیں۔

فن حدیث میں امام ابو علی سکرہ الصدفی، ان کے رفقاء اور تلامذہ بھی اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں، محدثین کا اتنا بڑا اجتماع اس وقت پورے عالم اسلام میں یہاں کے علاوہ اور کہیں نہیں تھا، اس عہد کے محقق محدثین میں ابو الحسن رزین بن معاویہ بن عمار العبدری ہیں جو مندرجہ ذیل کتابوں کے مصنف تھے: (۱) تجرید الصحاح الستۃ (۲) اخبار مکہ والمدینۃ وفضلھما (۳) کتاب فی جمع ما تضمنہ مسلم والبخاری والموطا والسنن والنسائی والترمذی، اور ابو بکر محمد بن خلف بن سلیمان المعروف بہ ابن فتحون الاوریولی مؤلف "الذیل علی کتاب الاستیعاب" و "اوھام کتاب الصحابۃ" اور ابو العباس احمد بن معد بن عیسیٰ التجیبی المعروف بہ ابن الاقلیشی مصنف "النجم من کلام سید العرب والعجم" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس عہد میں مشہور اور بلند پایہ مفسر عبدالحق غالب بن عطیہ گذرے ہیں، اور فقہاء کی تعداد کا تو شمار مشکل ہے، مشہور فلسفی ابن سید بطلیوسی کا بھی یہی زمانہ ہے جو فلسفی ہونے کے ساتھ

فن نحو کے بھی ماہر تھے، ان کی مشہور کتاب "الحدائق" ہے، تصوف میں ابو العباس بن العریف الصنہاجی کا یہی دور ہے جو "محاسن المجالس" کے مصنف ہیں۔

اس عہد میں علم ریاضی اور علم الافلاک کے بھی متعدد ماہرین پیدا ہوئے، جن میں ابن مسعود اشبیلی، جابر بن افلح اشبیلی، ابن سہل نابینا اور ابو اسحاق البطروجی کے نام سر فہرست ہیں، موخر الذکر نے علم نجوم میں ایک جدید نظریہ کا اختراع کیا ہے، جو آج بھی یورپ میں "Alpetrogia" کے نام سے معروف ہے۔

اس بنا پر پروفیسر ڈوزی کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ مرابطین کا دور علمی و ادبی حیثیت سے جمود وتعطل اور پسماندگی کا دور تھا، بلکہ در اصل یہ ادب، فلسفہ اور جملہ علوم و فنون کے ارتقاء کا دور تھا

فرضی واقعات کا اختراع اور حقائق و شواہد کی غلط تعبیر و تشریح

اندلس کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے اکثر مستشرقین کا ایک مذموم رویہ یہ بھی ہے کہ وہ مسلمانوں کے مختلف طبقوں مثلاً قائدین، فاتحین اور علماء وغیرہ کی شخصیتوں کو متہم اور مجروح کرنے کے لیے فرضی واقعات گھڑ لیا کرتے ہیں اور ان کی بنیاد پر وہ ہر اس چیز کو بھی مورد الزام ٹھہراتے ہیں جن کا کوئی تعلق اسلام یا مسلمانوں سے ہوتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ اندلس کے فاتح موسیٰ بن نصیر اور ان کے دست راست اور سپہ سالار طارق بن زیاد نے اپنی فتوحات کے دوران کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا، جو اصول جنگ کے منافی رہا ہو، اگر کوئی شہر مزاحمت کے بغیر ہی ان کے قبضہ میں آگیا تو انھوں نے اس میں امن و امان کی منادی کرا دی، اور اگر مزاحمت کی نوبت آئی تو فتح یابی کے لیے انھوں نے وہی طور طریقے اختیار کیے جو بالعموم جنگوں میں اختیار کیے جاتے ہیں، اندلس کے اکثر بڑے بڑے شہر تو بہت آسانی سے ان کے ہاتھوں فتح ہو گئے تھے، البتہ چند شہروں میں انھیں زبردست

مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا، مگر جب وہ بھی بزورِ شمشیر فتح ہوگئے تو ان کے باشندوں کے ساتھ بھی شرافت اور اسلامی اخلاق کا برتاؤ کیا گیا، جن شہروں میں فاتحین کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا ان کے سلسلہ میں بعض مستشرقین نے فاتحین کی جانب بعض فرضی واقعات منسوب کردیے ہیں لیکن ان کا وہ کوئی ماخذ نہیں بتاتے ہیں، جیسے مستشرق ایڈورڈو الباجی نے بلا حوالہ یہ لکھا ہے کہ "موسیٰ بن نصیر نے سرقسطہ بزورِ شمشیر فتح کیا"۔ آگے وہ اس اجمال کی یہ تفصیل بیان کرتے ہیں:

"موسیٰ نے شہر کے لوگوں پر بڑے ظلم ڈھائے، انھیں تلواروں سے ذبح کیا، شہر میں آتش زنی کی، نوجوانوں یہاں تک کہ شیر خوار بچوں کو بھی قتل کر ڈالا، غرض پورے علاقہ میں سخت تباہی آئی، اور قحط بھی پھیل گیا[1]۔"

یہ واقعہ سرے سے غلط اور بے بنیاد ہے، کیونکہ ان مسلمانوں نے فتوحات کے دوران کہیں بھی ایسا بے رحمانہ سلوک نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ شریعت مطہرہ کے ان احکام وہدایات کو مدنظر رکھا جو معلوم ومشہور ہیں، اور جن کی صراحت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس خط میں بھی موجود ہے جو انھوں نے حضرت یزید ابن ابی سفیان کو بھیجا تھا، اس لیے کسی صاحب کردار مسلمان کے ان واضح احکام کو نظر انداز کردینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ازروئے تحقیق بھی یہ واقعہ باور کیے جانے کے لائق نہیں ہے، کیونکہ ہماری دانست میں ایڈورڈو الباجی نے کوئی ماخذ ہی تحریر نہیں کیا ہے، پس وہ کسی طرح قابل وثوق نہیں، اس کے برخلاف مسلمان مورخین اپنی تمام روایتوں کو سنداً بیان کرتے ہیں، اور بڑی دیانتداری کے ساتھ واقعات کو مراجع کی تعیین کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔

اسی طرح خوسیہ کونڈی اور ڈوسیں دیاردے نے بھی اپنی کتاب "اسپین میں عربوں کی تاریخ" میں

[1] فجر الاندلس، حاشیہ ص ۴۴۳ بحوالۂ انسائیکلوپیڈیا کوٹریا ج ۸ ص ۲۰۴۔

من گھڑت روایتوں کو بنیاد بنا کر موسیٰ بن نصیر کو مطعون ومجروح کرنے کی کوشش کی ہے، یہ دونوں مستشرقین لکھتے ہیں کہ موسیٰ بن نصیر نے تطلونیہ، نبرہ اور ادغون کے مضافات میں بڑی تباہی مچائی، کیونکہ ان جگہوں کے باشندوں نے ان کا سخت مقابلہ کیا تھا، لیکن ان دونوں نے بھی کسی ماخذ کا ذکر نہیں کیا ہے، چنانچہ اسی وجہ سے مستشرق کوڈیرا نے اس روایت کو لغو قرار دینے کے بعد اس کو مذموم مبالغہ آرائی پر محمول کیا ہے۔

ہسپانیہ کے ان متعصب اور حاسد مستشرقین نے محض اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ ان واقعات کو درست اور صحیح باور کرانے کے لیے من گھڑت دلائل اور شواہد بھی وضع کیے ہیں، تاکہ اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کو مجروح کرسکیں، یا پھر ان کے پیش رووں نے جو غلط بنیادیں قائم کی ہیں، ان پر نئی عمارتیں تیار کریں، حالانکہ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ یہ لغو اور باطل چیزیں ہیں، مثلاً وہ عبد الرحمٰن الداخل کی نسبت سے ایک فرضی صلح نامہ پیش کرکے یہ کہتے ہیں کہ یہ عہد اس نے قشتالہ کے باشندوں سے کیا تھا، جب کہ اس کے پس منظر اور پیش منظر دونوں سے اس کے بے بنیاد ہونے کا ثبوت ملتا ہے، نیز عربی کی کسی بھی تاریخی کتاب اور معتبر ماخذ میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا، جب کہ عبد الرحمٰن الداخل کی شخصیت ایسی معمولی نہ تھی کہ مورخین اس کے اس درجہ اہمیت کے حامل واقعہ کا کوئی تذکرہ نہ کرتے، اس معاہدہ کو مشہور ہسپانوی مستشرق فرانسکو سیمونیٹ نے نقل کیا ہے جو مستشرقین کے پورے حلقہ میں عرب اور اسلام دشمنی میں معروف اور مشہور ہیں، اس صلح نامہ کا متن یوں ہے[1]:

بسم الله الرحمن الرحيم، كتاب	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، جلیل القدر بادشاہ
أمان الملك العظيم عبد الرحمن	عبد الرحمٰن کی جانب سے قشتالہ کے پادریوں
للبطارقة والرهبان والأعيان	راہبوں، اہم اشخاص اور شہر کے عیسائیوں

[1] فجر الاندلس، حاشیہ ص ۴۴۵۔

والنصارى الآمنة لسبين اهل تشتالة ومن تبعهم من سائر البلدان كتاب امان وسلام وشهد على نفسه ان عهده لا ينسخ ما اقاموا على تأدية عشرة آلاف أوقية من الذهب وعشرة آلاف رطل من الفضة وعشرة آلاف رأس من خيار الخيل ومثلها من البغال مع الف درع وألف بيضة ومثلها من الرماح في كل عام الى خمس سنين، كتب بمدينة قرطبة من صفر عام اثنين واربعين ماة

نیز ان کے علاوہ بقیہ دوسرے شہروں کے عیسائیوں کے لیے یہ معاہدۂ امن وسلامتی ہے، اپنے آپ کو گواہ بنا کر بادشاہ کہتا ہے کہ یہ معاہدہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک یہ لوگ دس ہزار اوقیہ سونا، دس ہزار رطل چاندی، دس ہزار عمدہ قسم کے گھوڑے، اتنے ہی خچر، ایک ہزار زرہیں، ایک ہزار خود، اور ایک ہزار تیر سالانہ پانچ برسوں تک ادا کرتے رہیں، یہ معاہدہ شہر قرطبہ میں ۳ صفر ۱۴۲ھ کو لکھا گیا۔ ...

اس صلح نامہ کے پہلے ہی جملہ سے اس کا فرضی ہونا ثابت ہوتا ہے، عبدالرحمٰن الداخل اندلس میں صقر قریش (قریش کا باز) کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، اس نے اپنے لیے بادشاہ کا لقب کبھی اختیار نہیں کیا، اور نہ وہ اسے پسند کرتا تھا، چہ جائیکہ وہ اپنے کو عظیم بادشاہ خود لکھے۔

اندلس میں ذمیوں کے ساتھ مسلمانوں کے سلوک اور رویہ کو بھی ہسپانوی مستشرقین نے خاص اہمیت دی ہے، اور اس بارہ میں کافی من گھڑت دلائل پیش کیے ہیں، یہاں تک کہ انھوں نے اس سلسلہ میں مستشرق بیلن کے اس فرضی صلح نامہ کو بھی ماخذ قرار دیا ہے، جس کے متعلق خود ان کی رائے

ہے کہ یہ فرضی اور من گھڑت ہے جو جرنل ایشیاٹک کی اٹھائیسویں جلد میں "حضرت عمرؓ بن الخطاب کا نصرانیوں کے ساتھ ایک معاہدہ" کے عنوان سے شایع ہوا ہے، اس میں عیسائیوں کو اس بات پر مجبور کیا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے جیسے لباس مثلاً ٹوپی اور عمامہ استعمال کریں، گھوڑوں پر سواری نہ کریں، غرض اس معاہدہ میں وہ تمام باتیں درج ہیں جن کی نسبت حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر مدبر اور انصاف پسند خلیفہ کی جانب ممکن نہیں ہے، ڈاکٹر حسین مونس اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اس میں جن ملبوسات کا ذکر ہے ان میں سے بعض تو حضرت عمرؓ کے عہد میں مسلمانوں کے درمیان رائج بھی نہ تھے"![1]

اس معاہدہ کو بنیاد بنا کر بعض مستشرقین نے اسلام کے متعلق بڑی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں جبکہ ان باتوں سے اسلام کا کوئی تعلق سرے سے نہیں ہے۔

مسلمان فاتحین کے معاہدے اور ان کا عفو و درگذر

اندلس کے عیسائیوں کے ساتھ مسلمان فاتحین کا رویہ فتوحات کی ابتدا ہی سے انتہائی شریفانہ رہا، جس کی کوئی مثال اندلس کی مسیحی تاریخ میں نہیں مل سکتی، اسی سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی عقیدہ مسلمانوں کے دلوں میں کس قدر راسخ اور جاگزیں ہوتا ہے کہ وہ جنگ کے میدان میں بھی اسلامی تعلیمات سے انحراف گوارا نہیں کرتے اس کی مزید وضاحت کے لیے ذیل میں تین صلح ناموں کا ذکر کیا جاتا ہے جو مسلمان فاتحین اور اندلس کے عیسائیوں کے درمیان ہوئے تھے۔

(۱) موسیٰ بن نصیر نے ماردہ کی فتح کے وقت وہاں کے باشندوں سے جو معاہدہ کیا تھا، اس کی تفصیل خود ایک ہسپانوی مستشرق کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

"شہر کے لوگ موسیٰ بن نصیر کے پاس آکر خود کہنے لگے کہ ہم جنگ کے دوران ہلاک اور

---

[1] فجر الاندلس، حاشیہ ص ۳۴۴۔

زخمی ہوجانے والوں کی تمام ملکیتیں اور کلیسا کا سارا مال ومتاع آپ کے حوالہ کر دیں گے،
موسیٰ بن نصیر اس پر راضی ہو گئے، چنانچہ اس پر فریقین کے درمیان معاہدہ ہوگیا، اور انھوں نے شہر کے دروازے کھول دیے اور اس کو مسلمانوں کے حوالہ کر دیا مسلمانوں نے شہر کے عیسائیوں کو ذرہ برابر بھی کوئی تکلیف نہیں دی اور نہ ان لوگوں سے کسی قسم کا کوئی تعرض کیا جو شہر چھوڑنا چاہتے تھے۔[1]

یہاں تین باتیں بڑی قابل غور ہیں جن کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے، ایک تو یہ صلح نامہ کا وہ ترجمہ ہے جس کو ایک ہسپانوی مستشرق پاسکوئل دگیانگوس نے اپنی مادری زبان میں کیا ہے، ہمارے خیال میں اگر اس کی اصل عربی زبان میں دریافت ہوتی تو وہ اس سے کہیں زیادہ واضح اور عیاں ہوتی، دوسرے یہ موسیٰ بن نصیر سے خود وہاں کے شہریوں کی پیش کش، موسیٰ بن نصیر نے ہرگز یہ چیزیں ان سے طلب نہیں کی تھیں، تیسرا امر یہ کہ نہ موسیٰ بن نصیر نے اور نہ ان کے فوجیوں نے شہر کے عیسائیوں کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی، بلکہ ان میں سے جنھوں نے کوچ کرنا چاہا ان سے کوئی تعرض بھی نہیں کیا گیا، موسیٰ بن نصیر اور ان کے فوجیوں کے اس حسن سلوک کے مقابلہ میں جب اسپین کے عیسائیوں نے اندلس پر دوبارہ قبضہ کیا تو انھوں نے وہاں کے مسلمانوں پر جو شدید مظالم کیے ان کے ذکر سے آج بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، جن کی تفصیل ہماری کتابوں کے علاوہ خود انکی کتب تاریخ میں بھی موجود ہے۔

(۲) طارق بن زیاد نے جب شہر استجہ پر حملہ کیا اس وقت وہاں راڈرک کا ایک معتمد والی تھا، اس معرکہ میں بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی اور بہت سے مسلمان شہید اور زخمی ہوئے، مورخین کا کہنا ہے کہ اس کے بعد مسلمانوں کو کہیں ایسی سخت جنگ کا سامنا نہیں کرنا پڑا، یہ پورا شہر

[1] فجر الاندلس ص ۴۴۲۔

قلعہ بند تھا، اور طارق اس کا محاصرہ کیے ہوئے تھا، اس اثنا میں شہر کا والی کسی ضرورت سے دریا کے کنارے آنکلا، اتفاق سے طارق بھی وہاں پہونچ گیا، گو طارق اس کو پہچانتا نہ تھا تاہم اس کو کچھ شبہ ضرور ہوا، وہ دریا میں کود پڑا، طارق نے بھی جست لگا کر اسے پانی میں ہی دبوچ لیا، اور پھر وہاں سے اسے لشکر گاہ میں لایا، اس کی شکل وشباہت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی معزز شخص ہے، چنانچہ جب طارق نے کرید کرید کر حالات پوچھے تو پتہ چلا کہ وہ شہر کا والی ہے، یہ معلوم ہوجانے کے بعد طارق نے اس سے صلح کی، علامہ شہاب الدین ابو العباس المقری کے الفاظ ملاحظہ ہوں :

فصالحه طارق على ما	طارق بن زیاد نے اس سے اپنے
أحب وضرب الجزية	حسب منشا مصالحت کی، اور اس پر
وخلّى سبيله، فوفى بما	جزیہ عائد کرکے اس کو آزاد کر دیا، والی
عاهد عليه [1]	اس معاہدہ کا پابند رہا۔

(۳) اور تیسرا صلح نامہ عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر اور تھیوڈمیر کے درمیان اس وقت ہوا تھا جب ان دونوں کی فوجیں ایک دوسرے کے مدمقابل ہوئی تھیں، اس صلح نامہ کی صحت ووثوق پر تمام مستشرقین بھی متفق ہیں، البتہ اس کے ترجمہ میں قدرے اختلاف ہے، جس کو ان کے ذوق وفہم کے تفاوت پر محمول کیا جاسکتا ہے، اس کا متن حسب ذیل ہے :

بسم الله الرحمن الرحيم، من	بسم اللہ الرحمن الرحیم، عبدالعزیز کی جانب
عبد العزيز الى تدميرانه	سے تھیوڈمیر کے نام یہ پیغام ہے کہ وہ
نزل على الصلح وانه له	صلح کی نیت سے آیا ہے، اس لیے

[1] نفح الطیب ج ۱، ص ۱۲۲۔

عهد الله وذمته ان لاينزع عنه
ملكه ولا احد من النصارى
عن املاكه وانهم لايقتلون و
لايسبون اولادهم ولانساءهم
ولايكرهون على دينهم ولاتحترق
كنائسهم ماتعبد ومانصح ، و
ان الذى اشترط عليه
انه صالح على سبع مدائن
اوريوله وبلنتله و
لقنت ومولة وبقسره
ودانيه ولورقه ،
وانه لايأوى لنا
عدوا ولا يخون لنا
آمنًا ولايكتم خبرًا
علمه وانه عليه و
على اصحابه دينار
كل سنة واربعة امداد
شعير واربعة اقساط
طلا واربعة اقساط

اس کے ساتھ یہ اللہ کے عہد اور میثاق
کے مطابق معاملہ کیا جائے گا یعنی اس کی
ملکیت اس سے نہیں لی جائے گی،
اور نہ کسی عیسائی کا مال و متاع
ضبط کیا جائے گا، نہ وہ، ان کی اولاد
اور عورتیں قتل کی جائیں گی، اور نہ وہ قید
کیے جائیں گے، نہ ان کے دین کے معاملہ
میں جبر کیا جائے گا، اور نہ ان کی وہ
عبادت گاہیں جلائی جائیں گی جن میں
اخلاص سے عبادت ہوتی ہو، اور اس
شرط کا اطلاق ان سات شہروں پر ہوگا
.اوریولہ[1]، بلنتلہ[2]، لقنت[3]، مولہ[4]، بقسرہ[5]
دانیہ[6] اور لورقہ[7]، وہ نہ ہمارے کسی دشمن کو
پناہ دیں گے اور نہ ہمارے کسی امن خواہ
کے ساتھ بدعہدی کریں گے، اور ہم سے
کوئی خبر پوشیدہ نہ رکھی جائے گی جس کا انہیں
علم ہو، اس کے علاوہ ان پر اور ان کے
ساتھیوں پر سالانہ ایک دینار، چار مد
گیہوں، اسی کے بقدر جو، چار قسط (دو صاع)

خل وقسط عسل وقسط
زيت ، وعلى العبد نصف
ذلك ، كتب فى رجب
سنة اربع وتسعين
وشهد على ذلك عثمان
بن ابى عبدة القرشى
وحبيب بن عبيدة الفهرى
وعبدالله ابن ميسرة الفهمى و
ابو قائم الهذلى[1]۔

دودھ، اتنا ہی سرکہ، ایک قسط (نصف
صاع) شہد اور ایک قسط زیتون کا تیل
واجب الادا ہوگا، اور غلام اس کا
نصف ادا کریں گے، رجب ۹۴ھ میں
یہ معاہدہ لکھا گیا اور عثمان بن ابی عبدۃ
القرشی، حبیب بن عبیدۃ الفہری، عبداللہ
ابن میسرۃ الفہمی اور ابو قائم الہذلی اسکے
گواہ ہیں۔

...

یہ معاہدہ بدستور قائم رہا، عبدالعزیز نے اس میں نہ کوئی رد و بدل کیا اور نہ اس علاقہ میں کبھی کسی ذمی کو جان و مال کا کوئی نقصان پہنچایا، اس نے ان کے مذہب سے بھی کوئی تعرض نہیں کیا،

مسلمانوں کا انصاف اور ان کی میانہ روی

اوپر اس کی وضاحت ہو چکی ہے کہ مسلمانوں نے جنگ کے دوران بھی اپنے مدمقابل لڑنے والوں اور اندلس کے عام باشندوں کے ساتھ کیسا شریفانہ برتاؤ کیا، وہ عہد و میثاق کے پابند، معاملات میں انصاف پسند اور باہم مساویانہ حقوق کا لحاظ کرتے تھے، یہی نہیں بلکہ وہاں کے عیسائیوں کو بھی انھوں نے اخوت و ہمدردی اور مساوات کا پورا درس دیا تھا۔

مستشرقین کے ایک طبقہ نے جن میں فرانسسکو سیمونیٹ اور ایڈورڈو دی لاس کانیجاس

[1] بغیۃ الملتمس ص ۲۵۹۔

سر فہرست ہیں اندلس کے اسلامی عہد کو آمرانہ اور ظالمانہ قرار دیا ہے، ان کے خیال میں مسلمان عیسائیوں پر ظلم و جور کرتے تھے اور ان کے ساتھ ناانصافی اور بدسلوکی سے پیش آتے تھے، سیمونیٹ کی ضخیم کتاب "المستعربون" اسی غلط تصور پر مبنی ہے، حالانکہ اندلس کے عام عیسائی تو درکنار، ان کے سرداروں کو بھی مسلمانوں سے کوئی گزند اور تکلیف نہیں پہونچی، شہنشاہ راڈرک کی بیوی ایجیلونا نے مسلمانوں کے حملہ کے وقت اپنی جان و مال کی بخشش کے بدلہ میں جزیہ ادا کرنے کی شرط پر صلح کی تھی اور عیسائی مذہب ہی پر قائم رہی[1]، بعد میں وہ عبدالعزیز بن موسیٰ کے عقد نکاح میں آئی اور ام عاصم کی کنیت سے مشہور ہوئی، کہا جاتا ہے کہ عبدالعزیز نے اشبیلیہ کے ایک کلیسا میں اس کی قیام گاہ بنوائی تھی، مورخین کی تصریح کے مطابق عبدالعزیز سے نکاح سے پہلے ہی سے اسے بڑا اعزاز و اکرام حاصل تھا، اور وہ دولت و ثروت کی مالک بھی تھی۔

اندلس میں عیسائی کافی متمول تھے، بلکہ بعض تو اس قدر املاک و جائیداد اور دولت و ثروت کے مالک تھے جتنی اکثر مسلمان والیوں کو بھی میسر نہیں تھیں، میمون عابد کا شمار اندلس کے ممتاز اور اہم لوگوں میں ہوتا ہے، ان کا یہ واقعہ پہلے گذر چکا ہے کہ وہ ارطباس بن غیطشہ کے پاس اس غرض سے پہونچے تھے کہ اس سے کچھ زمین لے کر کاشتکاری کریں، جس کی پیداوار کا نصف اس کو دے دیا کریں گے، حالانکہ ارطباس کو یہ عزت اور مرتبہ مسلمانوں کی وجہ سے ملا تھا، اور وہی اس کے سارے مال و متاع کے محافظ بھی تھے، ارطباس بھی میمون کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آیا، اور اس نے یہ کہا کہ بخدا جو زمین آپ کو دی جائے گی وہ آپ کی خدمت میں نذر کی جائیگی، اور اس سے حق کاشتکاری نہ لیا جائے گا، چنانچہ اس نے اپنے ایک وکیل سے بلا کر کہا کہ وادی شوش کی چراگاہ اور اس کے ساتھ ہی اس کی بکریاں، گائیں اور غلام نیز قلعہ جیان بھی ان کے

[1] نفح الطیب ج ۱، ص ۱۷۸۔

حوالہ کر دی جائے، اس طرح میمون کو یہ تمام چیزیں اس سے حاصل ہو گئیں[1]۔

اس وقت یہ بھی ممکن تھا کہ میمون ارطباس سے جبراً یہ چیزیں لے لیتے، مگر انھوں نے یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا کہ ان کے مذہب میں ذمی اور اہل کتاب کے مال و متاع کی حفاظت کی تاکید کی گئی ہے، ان کے اس برتاؤ کی وجہ سے ارطباس بھی ان کے ساتھ بڑے عزت و احترام سے پیش آیا۔

اس سے بھی زیادہ واضح مثال صمیل بن حاتم کے واقعہ میں ملتی ہے، جس کا ذکر بھی پہلے آچکا ہے، کہ وہ بھی اپنی حاجت برآری کے لیے ارطباس کے پاس گئے، وہ اندلس کی ایک ریاست کے والی اور پندرہ برس سے بھی زیادہ عرصہ سے وہاں بڑی اہم سیاسی حیثیت کے مالک تھے، اور عبدالرحمن الداخل کے اندلس پر استیلاء کے وقت تک ان کی سیاسی سرگرمیاں جاری رہیں، یہ بہت ہی ترش رو، تندمزاج، شہسواری کے ماہر اور بے حد فیاض تھے، مگر علم و ادب ناشناس تھے، ان کا مشہور قصہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک استاد کے پاس سے گذرے جو بچوں کو قرآن مجید پڑھا رہے تھے، اس وقت بچوں کے زیر درس یہ آیت تھی:

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۔ (آل عمران)

اور یہ تو اتفاقات وقت ہیں جو ہمارے حکم سے لوگوں میں نوبت بہ نوبت پیش آتے رہتے ہیں۔

اسے سن کر انھوں نے کہا "نداولها بین العرب" استاد نے کہا نہیں! "بین الناس" تو انھوں نے تعجب سے پوچھا: کیا آیت کا نزول اس طور پر ہوا ہے؟ ایسا شخص بھی طاقت و قوت، رعب و دبدبہ اور علم سے ناواقفیت کے باوجود محض

[1] افتتاح الاندلس، ابن القوطیہ ص ۳۹۔

اسلامی تعلیمات سے روشناس ہونے کی وجہ سے نہ تو سخت گیری اور تشدد کا کوئی قدم اٹھاتا تھا اور ضرورۃً بھی کسی کا مال ومتاع غصب کر لینے کا خیال دل میں نہ لاتا تھا، اور جب وہ سخت محتاج اور ضرورتمند ہوا تو اپنے ہی جیسے دشمن اور عرب سرداروں کے ہمراہ ارطباس کے پاس گیا اور اس سے کچھ مواضعات طلب کیے، ابن القوطیہ نے اس موقع پر اس کے اور ارطباس کے درمیان ہونے والے دلچسپ مکالمہ کو بھی نقل کیا ہے[1]، مگر طوالت کے خوف سے اسے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

یہ اور اس طرح کی دوسری بے شمار مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اندلس کے اسلامی عہد میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے باہمی تعلقات جارحانہ اور ظالمانہ نوعیت کے نہیں تھے، بلکہ عادلانہ اور منصفانہ تھے، وہاں کے عیسائی مسلمانوں کے زیر اقتدار رہ کر بھی اپنے مذہبی و شرعی معاملات اور تمدنی و معاشرتی زندگی میں مکمل خود مختار تھے، ان کے تمام معاملات قدیم گاتھک قانون (Forum Judicum) کے مطابق انجام پاتے تھے، کلیسا میں ان کی آمد ورفت کا سلسلہ بھی پہلے ہی جیسا تھا، ان حقائق کا اعتراف فرانسسکو سیمونیٹ نے بھی کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> "عیسائیوں کے اہم امور شہروں سے لے کر دیہاتوں تک اندلس کے عجمی عیسائیوں ہی کی نگرانی میں انجام پاتے تھے، یہ لوگ قومس کہے جاتے تھے، یہ گاتھک بادشاہوں کا لقب تھا، عربوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد بھی ان میں قماست کا عہدہ برقرار رہا[2]۔"

اندلس کے عیسائیوں کو آزادی رائے کی ضمانت

یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام ہمیشہ آزادی رائے کا حامی اور ضامن رہا ہے، اس کی اسی خصوصیت کی بنا پر اندلس کے مسلمان

[1] افتتاح الاندلس ابن القوطیہ ص ۴۰ . [2] المستعربون ص ۱۰۶

فرماں رواؤں نے وہاں کے عیسائیوں کو بھی آزادی رائے کے مواقع فراہم کر کے کلیسا اور مذہبی اشخاص کے بیجا ظلم وستم سے نجات دلائی، اسلامی حملہ سے پہلے مذہبی پیشوا عام لوگوں پر بڑا ظلم کرتے تھے اور حکمرانوں کو بھی اس بات پر مجبور کرتے تھے کہ وہ ان سے کیتھولک مذہب کو جبراً تسلیم کرائیں، اگر کوئی شخص کیتھولک عقیدہ سے پھر جاتا تو وہ غدار اور بے دین قرار پاتا تھا، اور یہی حال کلیسائے آرتھوڈکس کا بھی تھا، اور یہ دونوں مذہبی طبقے باہم دست بگریباں تھے، اور ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے تھے، خود ہسپانوی کلیساؤں کے اندر بھی مسیحیت کے بعض اہم عقائد کے بارے میں شدید اختلافات تھے، طلیطلہ کے پادریوں کی مجلسیں کئی کئی دن جاری رہتی تھیں اور یہ زبردستی لوگوں پر اپنے خیالات وعقائد تھوپتی رہتی تھیں، اس کی وجہ سے وہاں کے عیسائیوں کا ایک بڑا طبقہ کلیسا سے برگشتہ ہو کر عیسائیت کے بارہ میں شک وشبہہ اور تذبذب میں مبتلا تھا جس کو بالآخر اپنے مسائل کا حل اور مشکلات کا خاتمہ اسلام ہی میں نظر آیا[1]۔

اسلام نے اسپین کے عیسائیوں کے مذہبی معاملات میں دخل انداز ہوئے بغیر بھی انھیں آزادی فکر وعقیدہ کا موقع عطا کیا جس کے نتیجہ میں عام لوگ کلیسا اور مذہبی رہنماؤں کی بیجا قید وبندش سے آزاد ہو کر اپنے خیالات وعقائد کا برملا اظہار کرنے لگے، اسلامی دور میں کلیسا اور مذہبی اشخاص کو جبر وظلم سے ضرور باز رکھا گیا، مگر اس کے ساتھ ہی انھیں یہ حق بھی دیا گیا تھا کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کی تبلیغ واشاعت کر سکتے ہیں، اسلام اختلاف رائے میں انتقام اور ایذا رسانی کا انداز اختیار کرنے کو جائز نہیں قرار دیتا بلکہ شائستہ لب ولہجہ اور عمدہ پیرائے میں افہام وتفہیم کا طریقہ اختیار کرنے پر زور دیتا ہے، جہاں تک اسپین کے عیسائیوں کے مختلف مذہبی طبقوں کے اختلافات کا معاملہ ہے اس میں اندلس کی اسلامی حکومتوں نے کسی طبقہ کی حمایت ومخالفت کرنے کے بجائے بالکل غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا تھا، ان کا اور خصوصاً امرائے بنی امیہ کا رویہ اس قدر رواداری اور فراخ دلی پر مبنی تھا کہ قرطبہ کے ایک متعصب راہب الوارو نے بعض عیسائیوں کو اس بات پر آمادہ کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ اسلام، قرآن مجید اور رسول اللہ کی ذات مبارک کے

[1] فجر الاندلس ص ۴۷۹ و مابعد

متعلق ہرزہ سرائی کریں اس عصبیت اور انتقام کی آگ اس کے اندر اس وجہ سے اور بھی بھڑک اٹھی تھی کہ اس وقت عیسائیوں کی نئی نسل عربی زبان کی تعلیم و تعلم کی طرف زیادہ متوجہ ہوگئی تھی اور لاطینی سے ان کی بے رغبتی اور بیزاری بڑھتی جا رہی تھی جس کے نتیجہ میں اپنی کتب مقدسہ سے ان کے غافل اور بے بہرہ ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا الوارو نے اس کا سدباب کرنے کیلئے یہ غلط راستہ تجویز کیا کہ اسلام، پیغمبر اسلامؐ اور کتاب اللہ کو مطعون و مجروح کرنے کی مہم شروع کردی۔ اسکو اور اسکے ہمنواؤں کو یہ جرأت اسی لیے ہوئی کہ مسلمان حکمرانوں کا طرز عمل رواداری اور آزادی رائے پر مبنی تھا، نیز کلیسا اور اس کے راہبوں سے عدم تعرض اسلام کی تعلیم تھی۔

مستشرق سیمونیٹ نے اپنی متضاد روش کے برخلاف اس معاملہ میں حقیقت پسندی سے کام لیا ہے، ان کو بھی اعتراف ہے کہ مسلمانوں نے کلیساؤں کو کوئی ضرر اور نقصان نہیں پہونچایا، چنانچہ لکھتے ہیں:

"اسلامی حملہ کے وقت مسلمانوں کے لشکر کی آمد سے پہلے ہی پادریوں کی بڑی تعداد کلیساؤں کو چھوڑ کر شمالی علاقوں میں بھاگ کھڑی ہوئی، انھیں اندیشہ تھا کہ مسلمان دھوکہ سے انھیں قتل کردیں گے مگر جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمان کلیسا اور مذہبی رہنماؤں کے ساتھ ظلم و ستم کا کوئی معاملہ نہیں کرتے بلکہ انکے تمام مذہبی مقامات محفوظ ہیں، اور ان کے مذہبی معاملات میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کی جارہی ہے تو ان میں سے اکثر دوبارہ پھر اپنی جگہوں پر واپس لوٹ آئے[1]"

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا پورا دور اندلس کے عیسائیوں کے لیے امن وسکون اور خیر و برکت کا دور رہا، ان کو اپنے مذہب و عقیدہ کے معاملہ میں مکمل آزادی حاصل رہی، البتہ جن شہروں پر ان کے بجائے اس دور میں عیسائی بادشاہوں کا تسلط قائم ہوگیا اور وہ شہر مسلمانوں کے زیر نگیں نہیں رہ گئے، وہاں ضرور مسائل پیدا ہوئے اور عیسائیوں کے مختلف فرقوں میں سخت اختلافات رونما ہوئے، بلکہ وہاں کے عیسائیوں اور رومی عقائد و نظریات کے حامل عیسائیوں کے درمیان سخت معرکے اور خوں ریزیاں ہوئیں، جن میں کافی جانیں بھی ضائع گئیں اور املاک و اسباب کا بھی نقصان ہوا

[1] المستعربون ص ۱۲۲۔

(باقی)

داراشکوہ کے خواب

از

ڈاکٹر عبدالرب عرفان۔ صدر شعبۂ اردو و فارسی انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز ناگپور مہاراشٹر

خواب دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو انسان نیند کی حالت میں دیکھتا ہے، اور دوسرا وہ جو عین بیداری کے عالم میں۔ پہلی قسم کا خواب انسان کے تحت الشعور یا لاشعور میں پوشیدہ یا خفتہ کسی خواہش، کسی واقعے کے اثرات، ذہن پر مسلط گرد و پیش کے حالات، اس کے تصورات و آمال اور اس کے شخصی کوائف جیسے عوامل کی پیداوار ہوتا ہے۔ شاذ و نادر ایسے خواب بھی دکھائی دے جاتے ہیں، جن سے مستقبل میں پیش آنے والے حالات کا کبھی بصراحت اور کبھی تعبیر کے ذریعے علم ہوتا ہے۔

دوسری قسم کا خواب انسان پورے ہوش و حواس اور شعور کی بیداری کے عالم میں دیکھتا ہے۔ یہ دراصل اس کی کسی شدید خواہش اور دل نشین آرزو سے عبارت ہوتا ہے، جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے وہ شب و روز اور ہمہ وقت اپنی فکری اور عملی قوتوں کو منصوبہ سازی میں مشغول اور سرگرم عمل رکھتا ہے، ہر ممکنہ وسیلے کو بروئے کار لاتا ہے اور اس کے لیے ہزاروں جتن کرتا ہے۔

مغل شہنشاہ شاہجہاں کے خلف ارشد اور نامزد ولی عہد سلطنت محمد داراشکوہ حنفی قادری (مقتول ۱۰۶۹ھ) نے اپنی زندگی میں دونوں طرح کے خواب دیکھے۔ بیداری کے عالم میں تخت و تاج کا خواب دیکھا اور نیند کی حالت میں اگر اس کے سب ہی دعووں کو درست تسلیم کر لیا جائے تو متعدد عجیب و غریب نوعیت کے خواب دیکھے جنھیں قارئین کی دلچسپی، مطالعے اور تجزیے کیلئے اسکے

الفاظ میں بیان کیا جائے گا۔ اس کے خوابوں کی جانچ پرکھ اور ان کی تصدیق یا تکذیب کے لیے نامناسب نہ ہوگا۔ اگر پہلے اس کے کردار کے مختلف پہلوؤں کو اجمالاً واضح کر دیا جائے۔

شاہجہاں اپنے بیٹوں میں دارا کو سب سے زیادہ عزیز رکھتا تھا کیونکہ وہ متواتر تین بیٹیوں کی ولادت کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی بارگاہ میں ہزاروں نذر و نیاز کے بعد تولد ہوا تھا۔[1] شاہجہاں جو اس وقت جہانگیر کا "باباخرم" تھا۔ اسے سفر و حضر میں ساتھ رکھتا تھا۔ جہانگیر کی وفات (۱۰۳۶ھ) کے بعد جب شاہجہاں تخت نشین ہوا تو دارا مستقلاً دربار میں رہنے لگا جب کہ دیگر شاہزادے مختلف مہموں پر مامور کیے جاتے تھے۔ بادشاہ نے اس کے لیے تخت کے مقابل ایک کرسی رکھوا دی تھی۔ جس پر بیٹھ کر وہ دربار کی کارروائیاں دیکھتا تھا۔ شاہجہاں نے اس پر موقع بموقع انعامات، خطابات اور ترقی منصب کی جس طرح بارش کی اس کی نظیر پوری مغل تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ در اصل امرا کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا۔ کہ دارا ہی ہندوستان کے تخت و تاج کا وارث اور جانشین ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اس کے گرد موقع پرست اور خوشامدی مصاحبین کا ایک گروہ جمع ہو گیا۔ اول تو بادشاہ کی غیر معمولی شفقت و محبت، اس پر مستزاد زمانہ ساز ہم نشینوں کی تملق آمیز باتیں اور جھوٹی ستائشیں۔ ان حالات نے اسے انتہائی درجے کا خود رائے، خود ستا، اور خود بیں بنا دیا۔ وہ سمجھ بیٹھا کہ اس سے بڑا مدبر اور صائب الرائے کوئی نہیں۔ اسی زعم میں وہ جلیل القدر امرا کے ساتھ بھی نازیبا اور ہتک آمیز سلوک کرنے لگا۔ اس کا احساس خود شاہجہاں کو بھی تھا ایک بار اس نے اسے نصیحت کی تھی کہ "در حق امرای پادشاہی کج خلق و بدگمان نباشد"۔[2] ایک موقعے پر علی مردان خاں اور سعد اللہ خاں سے کہا تھا۔ کہ "نہیں پور خلافت . . . . . عدوی نیکاں و دوست بداں واقع شدہ"۔[3]

---

[1] سفینۃ الاولیا۔ دارا شکوہ۔ مطبع نولکشور کانپور ۱۹۰۰ء۔ ص ۹۲۔ [2] رقعات عالمگیری۔ مطبع نولکشور: ص ۲۰۔ [3] ایضاً۔ ص ۲۲۔

اپنی تند خوئی، بد مزاجی، خود رائی، خود ستائی اور خود بینی کے باوجود دارا کو عارف کامل ہونے کا بھی دعویٰ تھا۔ انیس[19] برس کی عمر میں شاہجہاں کے ساتھ اس نے شاہ میاں میر سے ملاقات کی۔ اس کے بعد ہی اس نے اپنا پہلا رسالہ موسوم بہ سکینۃ الاولیا تصنیف کیا۔[1] جس میں شاہ میاں میر اور ان کے مریدوں کے حالات بیان کیے ہیں۔ پھر ۱۰۴۹ھ میں جب کہ وہ عمر کی پچیسویں منزل میں تھا، مختلف سلسلوں کے مشایخ کا تذکرہ سفینۃ الاولیا مکمل کیا۔[2] ۱۰۵۶ھ میں سلوک کے عوالم اربعہ کے موضوع پر رسالہ حق نما ترتیب دیا۔[3] ۱۰۶۲ھ میں مختلف مشائخ کے شطحی اقوال پر مشتمل تالیف حسنات العارفین کی تکمیل کی۔[4] اس کے بعد ۱۰۶۵ھ میں مجمع البحرین کے نام سے وہ رسالہ لکھا جو اس کے قتل کا باعث بنا۔ ۱۰۶۷ھ میں سر اکبر کے نام سے اپنشد کا فارسی میں ترجمہ کیا۔[5] ان تصانیف و تراجم کے کیا محرکات اور کون سے عوامل تھے۔ یہ تو وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن قرائن پتہ دیتے ہیں کہ دارا اپنے ہم جلیسوں اور خصوصاً عوام میں ایک مرد عارف کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کرنا چاہتا تھا،

---

[1] عام خیال یہ ہے کہ دارا شکوہ کی پہلی تصنیف سفینۃ الاولیا (سال تکمیل ۱۰۴۹ھ) ہے اور دوسری تصنیف سکینۃ الاولیا (سال تکمیل ۱۰۵۲ھ) ہے لیکن سفینۃ الاولیا میں خود دارا کی اطلاع کے بموجب اس نے رسالہ سکینۃ الاولیا پہلے لکھا (مطبع نولکشور کانپور ۱۹۰۰ء ص ۴)، چونکہ سکینۃ الاولیا شاہ میاں میر (متوفی ۱۰۴۵ھ) اور ان کے مریدوں کا تذکرہ ہے، اور اس وقت ان میں سے اکثر حیات تھے۔ اس لیے ۱۰۵۹ھ تک اس میں ترمیم و اضافہ کا عمل جاری رہا، چنانچہ شیخ احمد سنامی کے ذکر میں لکھتا ہے۔ "رحلت ایشان روز جمعہ یازدہم ماہ شعبان سنہ ہزار و پنجاہ و نہ واقع شدہ"۔ (سکینۃ الاولیا، چاپ تہران۔ ص ۲۱)، [2] سفینۃ الاولیا۔ مطبع نولکشور کانپور ۱۹۰۰ء۔ ص ۲۱۶۔ [3] منتخبات آثار دارا شکوہ (رسالہ حق نما)۔ ص ۲۰۔ [4] تصحیحات و مقدمہ سید محمد رضا جلالی نائینی۔ تہران۔ ص ۸، [5] فہرست مشرح دفتر ہند، لندن۔ جلد اول۔ نمبر ۱۹۷۶۔

ہو کہ اس کا تصوف اورنگ زیب کے تشرع کا جواب بن سکے۔ اس معروضے کی تائید اُن بلند بانگ دعووں سے ہوتی ہے، جو دارا نے اپنی تصانیف میں جابجا کیے ہیں، سکینۃ الاولیا میں ایک جگہ لکھتا ہے۔

"حضرت پیر دستگیر میانجیو (میانجی) قدس اللہ سرہٗ در حیات بظاہر کمال عنایت برایں عاجز داشتند و بباطن نیز تربیت ایں فقیر می کردند و بعد از وفات ہم بطریق اویسی تربیت ایں مرید میکنند"[1]

حضرت پیر دستگیر (میانجیو) قدس اللہ سرہٗ زندگی میں ظاہراً اس عاجز پر عنایت بے نہایت فرماتے تھے اور باطناً بھی اس فقیر کی تربیت کرتے تھے اور وفات کے بعد بھی اویسی طریقہ پر اس مرید کی تربیت کرتے ہیں

حضرت خواجہ فریدالدین عطار قدس سرہٗ "اویسی" کی حقیقت اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

"قومی از اولیاء اللہ باشند کہ ایشان را مشایخ طریقت و کبرای حقیقت اویسیان نامند و ایشان را در ظاہر بہ پیر احتیاج نیست، زیرا کہ ایشان را حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم در حمایت و عنایت خود پرورش می دہند بی واسطۂ غیر چنانکہ اویس را دادہ اند رضی اللہ عنہ"[2]

اولیاء اللہ کا ایک گروہ ہے جنھیں مشایخ طریقت اور اکابر حقیقت "اویسی" کہتے ہیں اور انھیں ظاہر میں پیر کی حاجت نہیں کیونکہ انکی تربیت حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی واسطے کے بغیر اپنی حمایت اور عنایت سے فرماتے ہیں جس طرح (حضرت) اویس رضی اللہ عنہ کی (تربیت) فرمائی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دارا شاہ میاں میر کے معمولی اور عام مریدوں میں سے نہیں تھا، بلکہ ان کا "اویسی" تھا۔ اس نے سکینۃ الاولیا میں تو صرف اتنا لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ "الحال نیز در واقعہ بملازمت ایشان مشرف میشود"[3]۔ (اب بھی وہ خواب میں ان کی خدمت سے مشرف یاب

[1] چاپ تہران - ص ص ۴ - ۳، ۱۔ [2] سکینۃ الاولیا - ص ۳۰ - نفحات الانس، بتصحیح مہدی توحیدی پور - ص ۲۰ [3] مطبع نولکشور، کانپور، ۱۹۰۰ء، ص ۲۳۔

ہوتا ہے۔) لیکن سکینۃ الاولیا میں بصراحت الفاظ لکھتا ہے۔

"اکثر شبی در واقعہ بملازمت ایشان مشرف میشوم و نوازشہا می یابم و خود را اویسی ایشان میدانم چنانچہ شبی حضرت میانجیو را در واقعہ دیدم کہ بمن میفرمودند: بیا تا مشاہدہ بیاموزم و خود مراقبہ شدہ نشستند و مرا نیز ہمچنان نشاندند و تعلیم ہا کردند"[1]

میں اکثر خواب میں انکی خدمت سے مشرف ہوتا ہوں اور عنایتیں حاصل کرتا ہوں اور خود کو ان کا اویسی جانتا ہوں، چنانچہ ایک رات حضرت میانجیو کو خواب میں دیکھا کہ وہ مجھ سے فرما رہے تھے: آ میں تجھے مشاہدے کا درس دوں اور وہ خود مراقبے میں بیٹھ گئے اور مجھے بھی اسی طرح بٹھایا اور تعلیم دی۔

دارا نے جابجا دعوے کیے ہیں کہ اس کے پیر دستگیر شاہ میاں میر اس کے حال سے کبھی بے خبر نہیں رہتے تھے۔ وہ ہمیشہ ان کی بے انتہا شفقت و عنایت کا مورد قرار پایا، اس خصوص میں وہ اپنے خاص مریدوں کو بھی تلقین کرتے تھے کہ وہ دارا کے حال سے کبھی غفلت نہ برتیں۔ بحق دارا۔ ایک روز شاہ صاحب نے اپنے مخصوص دوستوں اور مریدوں مثلاً ملا صالح، شیخ احمد، میاں حاجی محمد بنیانی وغیرہم سے فرمایا۔

"چنانچہ من ہمیشہ متوجہ حال فلانی ام، شما نیز پیوستہ متوجہ حال او باشید، اگر شما یان از و روی بگردانید، از خدای خود رو گردان شدہ باشید"[2]

جس طرح میں فلاں (دارا) کے حال کی طرف ہمیشہ متوجہ رہتا ہوں، تم بھی اسکے حال کی طرف ہمیشہ متوجہ رہو۔ اگر تم اس سے روگردانی کروگے تو اپنے خدا سے روگردانی کروگے۔

ایک جگہ لکھتا ہے کہ ایک روز اس کا ایک ملازم شاہ صاحب کی خدمت میں گیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ دارا کا ملازم ہے تو اسے اپنے پاس بٹھایا۔ اور فرمایا۔

[1] چاپ تہران - ص ۵۲ [2] سکینۃ الاولیا، چاپ تہران - ص ۵۳۔

ع ای گل بتو خرسندم تو بوی کسی داری۔

اس نے حضرت سے التماس کی: "مجھے کچھ درس دیجیے"۔ انھوں نے فرمایا۔

"ہمیشہ در مراقبہ صورت صاحب خود را دیدہ باش"[۱]

ہمیشہ مراقبے میں اپنے آقا کی صورت دیکھا کر۔

آگے لکھتا ہے۔

"میاں شیخ عبدالواحد میفرمودند کہ گاہی بیاران خود امری کردند کہ صورت فلانی را تصور نمودہ متوجہ شدہ بنشینید"[۲]

میاں شیخ عبدالواحد فرما رہے تھے کہ ایک بار وہ اپنے دوستوں کو حکم دے رہے تھے کہ فلاں کی صورت کو تصور کر کے اس کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھو۔

ان بیانات کو اگر دارا کے ذہن کی اپج تسلیم کر لیا جائے تو وہ نہ صرف دروغ گو بلکہ خود ستائی کرنے والا بھی قرار پاتا ہے۔ بصورت دیگر یا تو شاہ میاں میر کے مریدوں نے اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہ روایتیں گھڑ کر اسے سنائی ہوں گی یا خود شاہ صاحب نے کسی مصلحت کے تحت یہ سب کچھ کہا ہوگا۔ جہاں تک شاہ میاں میر کا تعلق ہے۔ دارا کی تحریروں میں کوئی ایسا ثبوت نہیں ملتا جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ انھوں نے شہزادے سے کوئی توقع وابستہ کی ہو۔ اس لیے اس طرح کی باتیں جو شریعت ہی کے نہیں طریقت کے بھی منافی ہوں، ان سے منسوب نہیں کی جا سکتیں۔ ظن غالب یہ ہے کہ دارا کی لن ترانیاں سن کر شاہ صاحب کے مریدوں نے یہ روایتیں محض اس کی خوشنودی کے لیے گھڑلی ہوں گی۔

اس کے برعکس شاہ میاں میر کے خلیفہ ملا شاہ بدخشی نے مکرر اس امید کا اظہار کیا تھا۔ کہ دارا ملک میں طریقۂ قادریہ کو رواج دے گا۔[۳] اسی امید پر انھوں نے اپنی ایک غزل میں دارا کو "صاحبقران دل" کہا ہے۔[۴] انھوں نے دارا کے نام ایک خط بھی لکھا تھا۔ اور اس سے فرمایا تھا کہ

۱؎ سکینۃ الاولیا، چاپ تہران ص۵۳ ۲؎ ایضاً ۳؎ ایضاً ص۹۱ ۴؎ الفاً صن۱۸۰

تو میرے دوستوں کو نصیحت کر کیونکہ تو ان سب سے زیادہ عقلمند ہے۔[۱] غالباً دارا نے ملا شاہ کے اس حکم کی تعمیل کی کیونکہ وہ خود رسالۂ حق نما میں لکھتا ہے کہ میاں جیو غار حرا میں بارہ سال تک "سلطان الاذکار" میں مشغول رہے، تب کہیں انھیں "کشایش عظیم" حاصل ہوئی۔ اپنے اصحاب کو وہ اس شغل کا طریقہ اشاروں کنایوں میں بتاتے تھے، اس لیے رو سے مقصود ایک سال میں رونما ہوتا تھا۔ لیکن دارا نے جنھیں اس عمل کا درس دیا۔ انھیں دو چار روز میں مراد مل گئی کیونکہ وہ ہر بات بصراحت اور "بے پردہ" بیان کرتا تھا۔[۲]

ملا شاہ سے دارا کی بیعت اور روحانی فیض پذیری بھی صرف مرشد کی کیمیا اثر نگاہ و توجہ کی رہین منت رہی ہے۔ اس نے سلوک کے جملہ مقامات جنھیں حاصل کرنے کی خاطر اولیا اور عرفا نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ ریاضت و مجاہدہ میں بسر کیا۔ "بے سبب ریاضت و مجاہدات بسبب تاثیر نظر کامل" "مرشد پا لیے اور "مراتب تجرید و تفرید و دقایق عرفان و توحید" جیسا کہ حق معرفت ہے، "یک بیک" جان لیے۔[۳] ملا شاہ سے اکتساب فیض کا حال یوں بیان کرتا ہے۔

"آنچہ کسی در ماہی از ایشان می یافت من در شب اول یافتم و آنچہ کسی در سالی می یافت مرا در ماہی میسر شد و اگر در جای دیگر طالبی در سالہا بریاضت و مجاہدہ می یافت من بفضل او بی ریاضت یافتم و بیکبارگی دوستی ہر دو جہان از دل من بیرون شد"۔[۴]

ان سے کوئی شخص جو کچھ ایک ماہ میں پاتا تھا میں نے پہلی رات میں پا لیا اور جو کچھ کوئی ایک سال میں پاتا تھا مجھے ایک ماہ میں میسر آگیا اور اگر کسی دوسری جگہ (دوسرے مرشد کے پاس) کوئی طالب برسوں کی ریاضت اور مجاہدے کے بعد پاتا تھا میں نے انکے (ملا شاہ کے) فضل سے بے ریاضت پا لیا اور یک بارگی دونوں جہان میرے دل سے باہر نکل گئے

۱؎ سکینۃ الاولیا۔ چاپ تہران۔ ص ۱۷۱۔ ۲؎ رسالہ حق نما (مشمولہ منتخبات آثار دارا شکوہ) ص ص ۱۳-۱۴ ۳؎ ایضاً ۴؎ سکینۃ الاولیا، چاپ تہران۔ ص ۶

تاریخ کے طالب علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ دل سے دونوں جہاں کی دوستی کے نکل جانے کا دعویٰ کرنے والے دارا نے محض تخت و تاج کے حصول کی تمنا میں اپنے حقیقی بھائیوں کو حریف اور دشمن کی نظر سے دیکھا۔ ان کی مہموں کو ناکام بنانے کی سازشیں کیں۔ شاہجہاں کو ورغلا کر ان سے بدظن کیا۔[1] تاریخ اس کی بھی شاہد ہے کہ وہ خواب جو اُس نے بیداری کے عالم میں دیکھا تھا۔ دنیا ہی کی دوستی میں چکنا چور ہوا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اس کی تعبیر خود اس کے خون سے لکھی گئی۔

اس طویل تمہید کے پس منظر میں اب دارا کے بیشتر خواب پیش کیے جاتے ہیں ان خوابوں کی زمانی ترتیب کو اس کے عقاید کے عہد بعہد بدلتے ہوئے موسموں کا بیرومیٹر کہا جا سکتا ہے۔ اس کے ابتدائی دور کے خواب اسلامی تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں، دوسرے دور کے خوابوں پر موحدانہ نظریات کی چھاپ ہے اور آخری دور کے خواب ہندوانہ نوعیت کے ہیں۔ زمانی ترتیب میں اس کا پہلا خواب وہ قرار پاتا ہے۔ جو اس نے شاہ میاں میر کی وفات (ہفتم ماہ ربیع الاول ۱۰۴۵ھ) کے دن دیکھا۔ اس زمانے میں وہ اکبرآباد میں قیام پذیر تھا۔ لکھتا ہے۔

روزی یک پاس ماندہ در واقعہ می بیند کہ در خدمت پیر دستگیر حضرت میاں جیو حاضر است و ایشان بعضی نصایح و مواعظ فرمودہ میگویند تو بر ما نماز جنازہ بگذار و این فقیر چون این قسم امری بخاطر نمی توانست گذرانید، مضطرب شد از ین امر اجتناب می نماید، و حضرت ایشان بسیار مبالغہ و تاکید میفرمایند و ہم درین اثنا می بیند کہ ایشان را قضیہ ناگزیر روی دادہ و این فقیر بموجب حکم ایشان نماز گذاردہ و با اضطراب و بیتابی تمام بیدار گشتہ آثار حزن و گریہ در خود مشاہدہ نمودند۔[1]

ایک روز ایک پہر دن رہے وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ پیر دستگیر حضرت میاں جیو کی خدمت میں حاضر ہوا ہے اور وہ کچھ پند و نصیحت فرما کر کہہ رہے ہیں کہ تو ہماری نماز جنازہ ادا کر اور چونکہ یہ فقیر اس قسم کی بات دل میں نہیں لا سکتا تھا، پریشان ہو کر اس حکم (کو بجا لانے) سے گریز کرتا ہے اور آنحضرت بہت زیادہ زور اور تاکید کے ساتھ حکم دیتے ہیں، اور اسی اثنا میں وہ دیکھتا ہے کہ ان کا قضیہ ناگزیر (سانحہ وفات) واقع ہوا اور اس فقیر نے ان کے حکم کے بموجب نماز ادا کی اور انتہائی بے چینی اور بیتابی کے ساتھ بیدار ہو کر اپنے اندر گریہ و اندوہ کے آثار دیکھے۔

بقول خود دارا یہ خواب دیکھ کر متعجب بھی ہوا۔ اور فکرمند بھی۔ چند روز کے بعد لاہور سے حضرت میاں جیو کی وفات کی خبر آئی جس کے مطابق دارا نے شاہ میاں میر کی وفات کے دن اُسی گھڑی میں یہ خواب دیکھا تھا جس میں ان کا وصال ہوا اس طرح گویا وہ ان سے دور رہ کر بھی آخری لمحات میں ان کے قریب تھا، یہی نہیں، اس نے ان کی نماز جنازہ بھی (تنہا) ادا کی۔ دارا نے اپنے خواب کے بعد "صلحا" میں سے ایک اور شخص کا خواب بھی بیان کیا ہے، اس نے یہ دیکھا کہ ہاتف کی آواز آ رہی ہے، کہ ایک بندۂ الٰہی واصل بحق ہوا، جو کوئی اس کی نماز جنازہ میں شریک ہو گا خدا اس کی مغفرت فرمائیگا۔[2]

شاہ میاں میر کی وفات کے بعد دارا کی باطنی تربیت کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ اب وہ ان کا "اویسی" بن کر خواب میں براہ راست ان سے تربیت حاصل کرنے لگا۔ چنانچہ لکھتا ہے۔

شب دوشنبہ ہفتم ماہ ذی الحجہ نزدیک بصبح در واقعہ می بینم کہ حضرت میاں جیو ... بیرون خانہ دراز کشیدہ اند، چون مرا نظر بر ایشان افتاد، بخدمت ایشان رفتہ سلام گفتم، دست مرا گرفتہ فرمودند: نزدیک بیا و سینۂ من برہنہ کردند و از سینۂ خود ہم پیراہن برداشتہ زیر پستان جانب چپ

دوشنبہ، ۷ ذی الحجہ کی رات میں صبح کے قریب میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت میاں جیو ... گھر کے باہر لیٹے ہوئے ہیں جب میری نظر ان پر پڑی تو ان کی خدمت میں جا کر سلام کیا۔ انھوں نے میرا ہاتھ تھام کر فرمایا: قریب آ۔ اور میرا سینہ برہنہ کر دیا اور اپنے سینے سے بھی لباس ہٹا کر اپنی بائیں جانب کی پستان کو میری جانب

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے "مقدمہ رقعات عالمگیر" از پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی، اعظم گڑھ۔ سنہ ۱۹۵۰ء ص ۳۶۷ تا ۳۷۰۔

---

[1] سکینۃ الاولیاء۔ چاپ تہران۔ ص ۹۱ [2] ایضاً۔ ص ۹۸۔

پستان ہمان جانب مرا متصل کردہ مالیدند و فرمودند: بگیر امانت خود را، و انوار بی نہایت از سینۂ مبارک ایشان در سینۂ من چندان درآمد کہ گفتم بس است، و درونِ من پُر شد و الحال سینۂ من خواہد ترقید۔ تاب برداشت زیادہ برین ندارم، و از آن زمان سینۂ خود را صاف و نورانی و پر ذوق و وجد می یابم۔"[1]

کی پستان سے ملا کر رگڑا اور فرمایا: اپنی امانت لے اور انوار بے نہایت ان کے سینۂ مبارک سے میرے سینے میں اتنے در آئے کہ میں نے کہا کافی ہے اور میرا باطن پُر ہو گیا، اور اب میرا سینہ پھٹ جائے گا۔ مجھ میں اس سے زیادہ کے برداشت کی تاب نہیں اور اس زمانے سے میں اپنے سینے کو صاف نورانی اور ذوق و وجد سے معمور پاتا ہوں۔

اس خواب کی تاریخ تو دارا نے بیان کر دی لیکن سال تحریر نہیں کیا، غالباً یہ شاہ صاحب کی وفات کے بعد اسی سال کا واقعہ ہے۔ "سکینۃ الاولیا" کے دیباچہ میں ایک "خواب نما" واقعہ یوں بیان کرتا ہے:۔

روز پنجشنبہ در سن بیست و پنج سالگی در خواب بودم کہ ہاتفی آواز داد و چہار بار تکرار گفت کہ آنچہ ہیچ یکی از پادشاہان روی زمین میسر نشدہ آن را خدای تعالیٰ بتو داد۔[2]

پچیس [25] برس کی عمر میں جمعرات کے روز میں محو خواب تھا کہ ایک فرشتے نے آواز دی اور چار بار تکرار کہا کہ جو چیز روی زمین کے کسی بادشاہ کو میسر نہ آئی خدائے تعالیٰ نے تجھے بخش دی۔"

نیند سے بیدار ہو کر (بقول خود) اس نے اپنے تئیں سوچا کہ اس طرح کی سعادت عرفان الٰہی کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے، اس خواب کی تعبیر اسے اس صورت میں ملی کہ خدا نے اسے ۲ ذی الحجہ ۱۰۴۹ھ کی شب میں اپنے دوستوں میں سے ایک یعنی ملا شاہ بدخشی سے ملاقات کی سعادت عطا کی اور انھیں اس پر اتنا مہربان کر دیا کہ پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے اسے وہ سب کچھ عطا کر دیا۔ جو

[1] سکینۃ الاولیا۔ چاپ تہران۔ ص ۵۵ [2] ایضاً ص ص ۵-۶

دوسرے صوفیا و عرفا کو ریاضت و مجاہدت میں ایک عمر بسر کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔[1]

کوئی عارف کامل ایسی دولت عظمیٰ پا کر اس کا برملا اور بے محابا اظہار اس طرح نہیں کرتا کہ اس کی باتوں سے خود نمائی اور خود ستائی کی بو آئے۔ دارا کے اس دعوے کو کیا نام دیا جائے؟ اب سفینۃ الاولیا میں اُس کے بیان کردہ دو خواب ملاحظہ فرمائیں۔ پہلا خواب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ذکر میں شامل ہے، اور دوسرا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کے اختتام پر۔ لکھتا ہے۔

این حقیر در خواب بملازمت خلفای راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین مشرف گشتہ چنانچہ شبی در خواب می بیند کہ چہار کس بلباس سفید بزرگانہ متعاقب یکدیگر میروند، فقیر از شخصی پرسید کہ اینہا چہ کسانند؟ گفت چہار یار پیغمبر صلعم، فقیر از عقب ایشان روان گشت ایشان از دریا گذشتند، بر کوہی کہ بسیار بلند بود برآمدند، برابر ہم ایستادند، فقیر پیشتر رفتہ اول بخدمت صدیق اکبر رضی رسیدہ گفت السلام علیکم یا صدیق اکبر، در جواب فرمودند علیکم السلام، گفتم التماس فاتحہ دارم، فاتحہ خواندند، و بعد از ان ہمین روش بخدمت حضرت عمر فاروق رضی اعظم رفتم و سلام

یہ حقیر خواب میں خلفای راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کی خدمت سے مشرف ہوا۔ چنانچہ ایک رات وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ چار آدمی سفید بزرگانہ لباس میں ایک دوسرے کے پیچھے جا رہے ہیں، فقیر نے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ اس نے کہا پیغمبر صلعم کے چار یار، فقیر اُن کے پیچھے روانہ ہوا، وہ دریا سے گزرے، ایک پہاڑ پر جو بہت اونچا تھا چڑھ گئے اور ایک دوسرے کے برابر (قطار میں) کھڑے ہو گئے، فقیر آگے بڑھ کر پہلے صدیق اکبر رضی کی خدمت میں پہنچا اور کہا السلام علیکم یا صدیق اکبر، انھوں نے جواب میں فرمایا علیکم السلام، میں نے کہا فاتحہ (دعا) کی التماس کرتا ہوں، انھوں نے فاتحہ پڑھی اور اسکے بعد اسی طرح سے

[1] سکینۃ الاولیا، چاپ تہران ص ۶

گفتہ فاتحہ التماس نمودم، ایشان نیز خواندند و
باز بہمین طور بخدمت عثمانؓ ذوالنورین و حضرت
امیر المومنین علی رضی اللہ عنہم سلام
گفتہ و جواب شنیدہ التماس فاتحہ کردم ایشان
نیز دربارۂ این فقیر جدا جدا فاتحہ خواندند و فرمودند
بجہت یادگاری مامور شدہ ایم و فقیر را با عنایت
خاصی رخصت فرمودند و این خواب را از بیداری
بخت و سعادت مندی کونین خود میداند کہ چنین
عطیہ عظمیٰ مشرف گشتہ[1]

حضرت فاروقؓ اعظم کی خدمت میں گیا اور سلام کر کے
فاتحہ کی التماس کی، انھوں نے بھی فاتحہ پڑھی اور پھر اسی
طور سے عثمان ذوالنورین اور حضرت امیر المومنین علی
رضی اللہ عنہم کی خدمت میں سلام کیا اور جواب
سن کر فاتحہ کی التماس کی انھوں نے بھی اس فقیر کے حق میں جدا
جدا فاتحہ پڑھی اور فرمایا ہم ایک یادگار کیلئے مامور ہوئے
ہیں اور فقیر کو خاص عنایت کے ساتھ رخصت فرمایا اور
اس خواب کو فقیر اپنی بیداری بخت اور سعادتمندی
کونین جانتا ہے کہ وہ اس عظیم عطیے سے مشرف ہوا۔

اس خواب کا فقرہ "بجہت یادگاری مامور شدہ ایم" اپنے ابہام کے دامن میں بڑی گہری معنویت رکھتا ہے، اور ارباب نظر کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، چونکہ راقم الحروف کو کسی حتمی بات کے کہنے میں ارتکاب سہو کا احتمال ہے، اس لیے وہ اشارۃً صرف اتنا عرض کرنے پر اکتفا کرتا ہے کہ قارئین اس فقرے کی حقیقت اور معنویت آیندہ سطور میں نقل کیے جانے والے اُس خواب میں تلاش فرمائیں۔ جسے دارا نے حسنات العارفین میں بیان کیا ہے۔

سفینۃ الاولیا میں دارا نے اپنا دوسرا خواب اس طرح بیان کیا ہے:

اوّل شبی کہ این کمترین مریدان شروع در نوشتن
ذکر حضرت پیر دستگیر غوث اعظم نمود در واقعہ
خود را بہ بغداد یافت در گنبد مبارک آنحضرت

پہلی رات میں جب کہ اس کمترین مرید نے حضرت پیر
دستگیر غوث اعظم کے حالات لکھنے کی ابتدا کی خواب میں
خود کو بغداد میں آنحضرت کے گنبد مبارک میں اور

۱؎ سفینۃ الاولیا، مطبع نولکشور، کانپور۔ ۱۹۰۰ء۔ ص ۲۳۔

و بطواف حضرت امام موسی کاظم و حضرت
غوث اعظم رضی اللہ عنہم مشغول و از سعادت
مندی خود باین شرف عظمیٰ مشرف گشت و یقین
این فقیر شد کہ تحریر این کتاب مقبول گشت"[1]

حضرت امام موسیٰ کاظم اور حضرت غوث رضی اللہ
عنہم کے طواف میں مشغول پایا اور اپنی سعادت
مندی سے اس شرف عظمیٰ سے مشرف ہوا اور اس
فقیر کو یقین ہو گیا کہ اس کتاب کا تحریر کیا جانا
مقبول ہو گیا۔

سفینۃ الاولیا میں شاہ میاں میر یا کسی اور ہم عصر صوفی کے تعلق سے کوئی خواب نقل نہیں کیا، شاہ میاں میر کے بارے میں صرف ایک جملہ لکھ کر ظاہر کر دیا ہے کہ وہ اب بھی خواب میں ان کی خدمت سے شرف اندوز ہوتا ہے۔[2]

رسالہ حق نما میں نہ کوئی خواب منقول ہے نہ کسی خواب کا ذکر۔ اس تصنیف کا محرک ایک غیبی آواز تھی۔ دارا لکھتا ہے کہ شب جمعہ ۹ رجب المرجب ۱۰۵۵ھ کو اسے آواز غیب سنائی دی کہ اولیاے خدا کے سلسلوں میں بہترین "سلسلۂ علیہ و طریقت سنیۂ قادریہ ہے"[3]، اسی رات وہ اس رسالے کی ترقیم پر مامور ہوا۔

اس منزل پر پہنچتے پہنچتے دارا کے افکار و عقاید میں زبردست انقلاب رونما ہو چکا تھا۔ لیکن ان کے اظہار کے سلسلے میں وہ بہت محتاط رہا۔ رفتہ رفتہ اس کے مزاج میں بے باکی سرایت کرتی گئی۔ چنانچہ حسنات العارفین کی تالیف کے ضمن میں پہلی بار ہندو جوگیوں اور بیراگیوں بابا لال مندیہ اور بابا پیارے کا اسم و رسم کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اوّل الذکر کو "اکمل عرفا" قرار دیتے ہوئے تحریر کرتا ہے۔

در ہنود بعرفان و متانت او کسی دیدہ نشدہ؛

ہندوؤں میں اسکے عرفان و متانت کی برابری کرنے

۱؎ سفینۃ الاولیا، مطبع نولکشور کانپور ص ۲۵ ۲؎ ایضاً ص ۳۳ ۳؎ رسالہ حق نما، مشمولہ منتخبات آثار دارا شکوہ، ص ۲

مرا گفت کہ در ہر قومی عارف و کامل می باشد کہ حق تعالے برکت او آن قوم را نجات می دہد۔ تو منکر ہیچ قوم مباش"۔[1]

والا کوئی شخص نہیں دکھا گیا اس نے مجھ سے کہا کہ ہر قوم میں عارف و کامل ہوتا ہے، جس کی برکت سے حق تعالے اس قوم کو نجات دیتا ہے، تو کسی قوم کا منکر نہ بن۔

منقولہ بالا قول سے صاف پتا چلتا ہے کہ حسنات العارفین کی تالیف (۱۰۶۲ھ) کے وقت دارا ہندو جوگیوں اور بیراگیوں بالخصوص بابالال ہندیہ سے خاصی رسم و راہ پیدا کر چکا تھا۔[2] اور ان سے تبادلۂ خیال کے ذریعے ویدانتی فلسفے کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں قادری مسلک میں رواداری کا رجحان راہ پا چکا تھا۔ اور وحدتِ ادیان کے نظریے کو اس کی حمایت حاصل تھی۔[3] اس لیے دارا نے اس کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور اسلامی تصوف اور ویدانتی فلسفے کے نظریات و تصورات میں مماثلتیں تلاش کرنے اور ان کی باہمی تطبیق کا سلسلہ شروع کیا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ وہ اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کو اپنا ہمنوا بنا کر اپنے اصل خواب کو حسب دلخواہ تعبیر آشنا کر سکے گا۔ لہذا اب اس کے پیش نظر صرف ایک مقصد تھا۔ ایک موحد کی شان و عظمت کے ساتھ خود کو خواص و عوام سے متعارف کرانا۔ آیئے۔ دیکھیں وہ توحید کا درس کس بارگاہ عالیہ میں اور کس انداز سے حاصل کرنے کا دعوی کرتا ہے۔

---

[1] حسنات العارفین، با تصحیحات و مقدمہ سید مخدوم رہین۔ تہران۔ ص ۹ [2] جوگیوں اور بیراگیوں سے اپنے میں جول کا جواز خواجہ احرار کے قول "اگر دانم کہ کافری زمزمۂ توحید بہنجار میسراید، میروم واز وی میشنوم و منت وارمی شوم" سے پیش کرتا ہے۔ (مجمع البحرین۔ مشمولہ منتخبات آثار۔ ص ۲) [3] مثلاً۔ شیخ محب اللہ الہ آبادی کا اس نکتے پر اصرار تھا۔ کہ رسالت مآب صلعم رحمۃ للعالمین تھے۔ رحمۃ للمسلمین نہیں (رود کوثر۔ محمد اکرام۔ ص ۔ ۱۹۶)

حسنات العارفین میں وہ یہ خواب نقل کرتا ہے۔

"شبی این فقیر آن سرور را صلی اللہ علیہ وسلم بر تختی نشستہ دید۔ ابو بکرؓ و عمرؓ بر دست راست او نشستہ و جنیدؒ متصل ایشان و عثمانؓ و علی کرم بر دستِ چپ و پیرِ من غوث الثقلینؒ متصل ایشاں نشستہ و ذو النونؒ مصری و بشر حافیؒ و دیگری از مشایخ کبار و مولانا عبد الرحمن جامیؒ و استادِ من شیخ میر ہم در آن مجلس بودند۔ از انجا کہ مرا ہمیشہ ذوقِ این بود کہ توحید از ان حضرت علیہ السّلام بیاموزم، پای مبارک آن سرور را بوسیدم و گفتم۔ یا رسول اللہ! چیست توحید؟ آن حضرتؐ از روی بشاشت و خوشی انگشت ہای دست راست را بستہ، انگشت شہادت را بر داشتند، نزد غوث الثقلینؒ رفتہ این اشارہ پرسیدم، فرمودند کہ توحید در عبارت نگنجد و اشارہ کافی است چون راز بزبان نتوان گفت پیغمبر صلی اللہ علیہ (کذا) یک انگشت برداشت و اشارت بہ احدیت کرد

ایک رات اس فقیر نے آنسرور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تخت پر بیٹھے ہوئے دیکھا، ابو بکرؓ اور عمرؓ انکے دائیں طرف بیٹھے ہوئے تھے اور جنیدؒ ان سے متصل اور عثمانؓ و علی کرم انکے بائیں جانب بیٹھے ہوئے تھے، اور میرے پیر غوث الثقلینؒ ان سے متصل اور ذو النونؒ مصریؒ اور بشر حافیؒ اور اکثر مشایخ کبار اور مولانا عبد الرحمن جامیؒ اور میرے استاد شیخ میر بھی اس مجلس میں تھے، چونکہ مجھے ہمیشہ اسکا اشتیاق تھا کہ میں توحید کا درس آنحضرت علیہ السلام سے لوں میں نے آنحضرت کے پائے مبارک کو بوسہ دیا اور کہا۔ یا رسول اللہ! توحید کیا ہے؟ آنحضرت نے بشاشت اور خوشی کے ساتھ سیدھے ہاتھ کی انگلیاں بند کر کے شہادت کی انگلی اٹھائی۔ میں نے غوث الثقلینؒ کے پاس جا کر اس اشارے کے بارے میں پوچھا، انھوں نے فرمایا کہ توحید عبارت میں نہیں سماتی اور (اس کے لیے) اشارہ کافی ہے، چونکہ راز زبان سے نہیں کہا جا سکتا پیغمبر صلی اللہ علیہ (وسلم) نے ایک انگلی اٹھائی، اور احدیت کی جانب اشارہ کر دیا۔ توحید کا نقطہ کمال

کمال توحید یک دانستن و یک دیدن است[1] ایک جاننا اور ایک دیکھنا، دیک دانی دیک بینی، ہے۔

اس خواب کے آخری جملے کی ذو معنویت پر غور فرمائیے۔ "یک دانستن و یک دیدن" سے بادی النظر میں دارا کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے، کہ کائنات کے موجودات کی کثرت میں وحدت کا مشاہدہ کیا جائے۔ لیکن اس کا یہ مدعا ہرگز نہیں ہو تو تمام مذاہب و مشارب اور ان کے پیروؤں میں مشاہدۂ وحدت کا قائل تھا۔ اس کے نقل کردہ بابا لال مندیہ کے قول "در ہر قومی عارف و کامل می باشد۔۔۔ تو منکر ہیچ قوم مباش" سے بھی اسی نظریے کی ترجمانی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس خواب کے بعد ۱۰۶۵ھ میں اس نے مجمع البحرین لکھی۔ اس تصنیف میں اس نے نظریۂ وحدت ادیان کا پوست کندہ اظہار کر دیا۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی تصوف اور ویدانتی فلسفے میں محض لفظی اختلاف ہے۔[2]

اب دارا کے منقولہ بالا خوابوں کی روشنی میں حسب ذیل نکات پر توجہ فرمائیں۔

۱۔ حسنات العارفین کی تالیف (۱۰۶۲ھ) سے پہلے دارا کی کسی تحریر سے صراحتاً و درکنار کنایتاً بھی پتا نہیں چلتا کہ اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے "براہ راست" توحید کا درس لینے کا "ہمیشہ" اشتیاق رہا ہے۔

۲۔ سکینۃ الاولیا میں خواجہ فرید الدین عطار قدس سرہ کی بیان کردہ "اویسی" کی جو تعریف نقل کی گئی ہے، اس کے مطابق ان مشایخ کو "اویسیان" کہا گیا ہے، جنھیں باطنی تربیت کے لیے کسی پیر کی حاجت نہیں۔ وہ لوگ باطنی تربیت "بوساطۂ غیر" بارگاہ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح حاصل کرتے ہیں۔ جس طرح حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے حاصل کی تھی۔

[1] حسنات العارفین۔ تہران۔ ص ۱۶ [2] مجمع البحرین (مشمولہ منتخبات آثار داراشکوہ) ص ۱۰۲

اسی طرح بعض اولیا اللہ نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متابعین میں سے تھے۔ بعض طالبوں کی "بحسب روحانیت" تربیت فرمائی ہے، طالبوں کی وہ جماعت بھی اویسیوں میں داخل ہے۔[1] اس تعریف کی روشنی میں شاہ میاں میر کو جن کی باطنی تربیت، بقول دارا، حضرت غوث الثقلین قدس سرہ نے فرمائی "بیک واسطۂ اویسی قرار دینا" کہاں تک درست ہے، جبکہ غوث الثقلین خود اویسی تھے اور تابعین میں سے نہیں تھے۔

۳۔ دارا نے صرف شاہ میاں میر ہی کو اویسی کا درجہ عطا نہیں کیا، بلکہ خود بھی ان کا اویسی بن بیٹھا۔ اس طرح گویا وہ اپنے خود ساختہ اویسی کے تصور کے مطابق ایک اویسی (حضرت غوثؒ کے اویسی (شاہ میاں میر) کا اویسی ہونے کا دعوی نہیں کر گزرا، اسی طرح موخر الذکر خواب میں حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم سے "براہ راست" توحید کا درس حاصل کرنے کا اعلان کر کے درپردہ یہ دعوی بھی نہیں کر گزرا کہ وہ "بے واسطۂ غیر" حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی اویسی ہے؟

۴۔ قارئین اب اس خواب پر نظر ڈالیں۔ جس کے مطابق خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین نے دارا سے بلا استفسار فرمایا۔ "بہشت یادگاری مامور شدہ ایم" اور فیصلہ فرمائیں کہ کیا اب بھی اس جملے کا ابہام باقی رہا ہے؟

۵۔ موخر الذکر خواب میں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کی نشست کی جو ترتیب بیان کی گئی ہے، وہ بھی دعوت غور و فکر دیتی ہے۔ اس کی رو سے خلیفۂ سوم خلیفۂ دوم سے برتر مقام پر تشریف فرما تھے۔ کہ انھیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب حاصل تھا۔

[1] سکینۃ الاولیا۔ تہران۔ ص ۳۰ نیز نفحات الانس۔ تہران۔ ص ۲۰ [2] ایضاً۔ ص ۱۲۴۔

۶۔ اس خواب کا فقرہ "پای مبارک آن سرور را بوسیدم" بھی توجہ طلب ہے۔ حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے کبھی کسی کو پابوسی کی اجازت عطا نہیں فرمائی۔ پھر آپؐ دارا کی اس خلاف شرع حرکت پر بشاشت کا اظہار کیونکر فرما سکتے ہیں؟

ان نکات کی روشنی میں دارا کے بیشتر خوابوں کی حیثیت مشکوک قرار پاتی ہے۔ ان خوابوں کے بیان کرنے کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں تھا کہ لوگ اسے عارف کامل جانیں اور مانیں۔ چنانچہ اس مفروضے کی تائید اس کے ان بلند بانگ دعووں سے ہوتی ہے جن میں سے چند اس مضمون کے ابتدائی حصے میں نقل کیے جا چکے ہیں۔

اب تک بیان شدہ خوابوں کے آئینے میں دارا کی نام نہاد عارفانہ اور موحدانہ شخصیت کا صرف ایک رخ نظر آتا ہے، دوسرے رخ کے ابتدائی نقوش حسنات العارفین میں بابالال منڈیہ اور باباپیارے کے ذکر اور اول الذکر کے قول جو سطور بالا میں نقل کیا جا چکا ہے۔ کی شمولیت کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مجمع البحرین میں یہ پہلو کھل کر سامنے آتا ہے۔ اس کتاب میں اس نے اسلامی تصوف اور ویدانتی فلسفے کی مماثلت کے بیان اور ان کی باہمی تطبیق ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ پہلی بار ہندوؤں کی قدیم کتابوں یعنی چار ویدوں کو آسمانی صحایف کہنے کی بھی جرأت کر ڈالی۔[۱]

مجمع البحرین کی تالیف کے ایک سال بعد (۱۰۶۶ھ میں) اس کے حکم سے جوگ بشسٹ کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کا مقدمہ خود دارا نے لکھا۔ جس میں اس کا ترجمہ کرانے کی وجہ یہ بیان کی۔

[۱] منتخبات آثار۔ ص ۲ اور ص ۱۵۔ داپنشد کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ یہ کتابیں اس وقت کے سب سے بڑے نبی برہما یعنی آدم صفی اللہ پر نازل ہوئیں) نعوذ باللہ من ذالک۔

"اس کتاب کے انتخاب کا ترجمہ جو شیخ صوفی کے ساتھ منسوب ہے، ہم نے مطالعہ کیا تو رات کو خواب میں دیکھا کہ دو بزرگ قبول صورت ایک اونچے پر اور دوسرے کسی قدر ان سے نیچے کھڑے ہوئے معلوم ہوئے، جو اونچے پر کھڑے تھے بششٹ تھے۔ اور دوسرے رام چندر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں بے اختیار بششٹ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بششٹ نے نہایت مہربانی سے ہاتھ میری پیٹھ پر رکھا، اور فرمایا اے رام چندر! یہ سچا طالب ہے اور سچی طلب میں تیرا بھائی ہے، اس سے بغل گیر ہو۔ رام چندر کمال محبت کے ساتھ مجھ سے ملے۔ اس کے بعد بششٹ نے رام چندر کے ہاتھ میں مٹھائی دی تاکہ مجھے کھلا دے۔ میں نے وہ شیرینی کھائی۔ اس خواب کے دیکھنے پر ترجمے کی خواہش از سر نو زیادہ ہوئی اور دربار عالی کے حاضرین میں سے ایک شخص مقرر اس خدمت پر ہوا۔[۱] اور ہندوستان کے پنڈتوں سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کتاب کے لکھنے میں اہتمام و انصرام کیا۔"[۲]

یہ دارا کے خوابوں کے سلسلے کی آخری کڑی اور اس کے دور بہ دور بدلتے ہوئے عقاید کے معکوس سفر کا نقطۂ عروج ہے، اس خواب کے بارے میں پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی مرحوم نے بدگمانی کا اظہار فرماتے ہوئے بڑے نکتے کی بات کہی ہے۔ رقمطراز ہیں۔

"جوگ بششت کے ترجمہ کرانے کا جو فانی اور الہامی سبب کتاب میں بتایا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہم کو یہ خیال ظاہراً ترجمے کا زیادہ مؤید معلوم ہوتا ہے، کہ چونکہ اس کتاب میں مہاراج رام چندر جی کے بادشاہ وقت ہونے کے باوجود اوتار ہونے کو

[۱] سجان رائے نے اصل مترجم کا نام شیخ احمد بیان کیا ہے۔ (خلاصۃ التواریخ۔ ص ۶) [۲] مقدمہ رقعات عالمگیر۔ سید نجیب اشرف ندوی۔ ص ۳۶۰

دکھایا گیا ہے۔ اس لیے۔ دارا اس ترجمے کے ذریعے یہ بات باور کرانا چاہتا ہے کہ اگرچہ وہ ظاہراً ولیعہد شاہجہاں ہے، لیکن بباطن وہ بھی رام چندر جی کی طرح واصل الی الحق بزرگ ہے۔ خود کتاب کے ترجمے کے جو اسباب بیان کیے گئے ہیں وہ ہماری اس بدگمانی کے مؤید ہیں۔“ [1]

سید نجیب اشرف صاحب نے نہایت محتاط انداز میں وہ سب کچھ فرمادیا جو دارا کے اس خواب کو پایۂ اعتبار سے گرا دینے کے لیے کافی ہے۔ موصوف کو اس خواب کے تعلق سے جو بدگمانی ہے وہی بدگمانی راقم الحروف کو دارا کے کم و بیش تمام خوابوں کے تعلق سے ہے۔ آیئے، زمانی ترتیب میں اس کے اہم خوابوں پر نظر ڈالیں۔

۱۔ شاہ میاں میر کے ”واقعۂ ناگزیر“ والے خواب میں اس نے ان کی نماز جنازہ (تنہا) ادا کی اور ایک بندۂ صالح کے خواب کی رو سے کہ شاہ صاحب کی نماز جنازہ ادا کرنے والے مغفور ہیں، وہ مغفور ہوگیا۔

۲۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین اس کے خواب میں آئے تو بلا استفسار فرمایا کہ ہم ایک یادگار پر (یادگار کی تلاش پر؟) مامور ہوئے ہیں۔ پھر اسے عنایت خاص کے ساتھ رخصت کیا۔

۳۔ پھر اس نے رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کے چاریارؓ اور مشائخ کبارؒ کے ساتھ دیکھا۔ اور توحید کا درس براہ راست حاصل کیا۔ اس طرح اس نے اپنے ”بے واسطہ غیر“ بھی اویسی ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ گویا وہ خود کو صحابہ و تابعین کا ہم مرتبہ تسلیم کروانے اور گیارہویں صدی ہجری کا خلیفۃ المسلمین بننے کا خواب

---

[1] مقدمہ رقعات عالمگیر۔ سید نجیب اشرف ندوی۔ ص ۳۵۹

دیکھ رہا تھا۔

۴۔ چونکہ اصل خواب کو تعبیر آشنا کرنے کے لیے ملک کے اکثریتی فرقے کی حمایت بھی مطلوب تھی۔ لہٰذا بشسٹ اور رام چندر جی سے بھی ”خواب میں“ ملاقات کرلی۔ اور رام چندر جی کی طرح اپنے اوتار اور مستقبل کے بادشاہ ہونے کی طرف واضح اشارہ کردیا۔

دارا کے مبینہ خوابوں کے بالاستیعاب مطالعے اور تجزیے سے مستنبط ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت مسلمانوں اور ہندوؤں کا اعتماد حاصل کرکے خلافت اور رام راج کو اپنی نام نہاد وحدانیت کے گمراہ کن تصور میں ڈھال کر تخت و تاج پر بلاشرکت غیرے متصرف ہونے کا خواب دیکھ رہا تھا لیکن مشیت کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ اس کے نام نہاد تصوف پر عالمگیری تسنن اور تشرع نے ایک ایسی کاری ضرب لگائی کہ اس کے عالم بیداری کے خواب کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور ”دل سے دنیا کی دوستی دور ہوجانے کا دعویٰ کرنے والے دارا کو حکومت کا خیال ترک کرکے صرف دنیا میں عمر کے بقیہ ایام گزارنے کے لیے اورنگزیب سے زندگی کی بھیک مانگنی پڑی۔ وہ بھی اسے نہیں ملی۔

سید صباح الدین عبدالرحمنؒ

از

ڈاکٹر عبدالمغنی صدر شعبہ انگریزی، پٹنہ یونیورسٹی

علامہ شبلیؒ نے ایک خواب دیکھا، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس کی تعبیر نکالی، دارالمصنفین اعظم گڈھ قائم ہوگیا۔ اس نے اتنی ترقی کی کہ علم وادب کی اجتماعی کوششوں کا ایک نمونہ بن گیا اور اس کی مثال دی جانے لگی۔ کیا تصنیف وتالیف، کیا کتابت وطباعت، دارالمصنفین نے اردو کتب ورسائل کی اشاعت کا ایک معیار دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کے مکتبے سے جو کتابیں شائع ہوئیں انھوں نے تاریخ بنائی اور وہ تاریخیں لکھیں جنھوں نے مغرب کی ذہنی دست برد کے مقابلے میں مشرق کے حوصلے بلند کر دیئے۔ اور متعدد ان موضوعات کا فیصلہ مشرق کے حق میں کر دیا۔ جن کے متعلق اہل مغرب کے اس کم علم وکم نظر طبقے نے جسے مستشرقین کہا جاتا ہے۔ طرح طرح کی غلط فہمیاں دانستہ یا نادانستہ بلکہ دونوں طور پر خود اہل مشرق کے جدید تعلیم یافتہ افراد کے درمیان پیدا کر دی تھیں۔ چنانچہ ان افراد نے دارالمصنفین کے اس عظیم الشان کارنامے کا احسان مانا اور برملا اس کا اقرار کیا۔ اپنے وقت کے سب سے بڑے مغربی تعلیم یافتہ، ڈاکٹر سر محمد اقبال نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کو جوئے اسلام کا فرہاد بھی کہا۔ اور خیام پر ان کی تصنیف کو اپنے موضوع پر تمام مباحث کا خاتم بھی قرار دیا۔

دارالمصنفین اعظم گڈھ اس لحاظ سے بھی منفرد وممتاز ہے، کہ اسے مصنفین ہی نے قائم کیا۔

اور ترقی دی، جب کہ عام طور پر ایسا ادارہ یا تو کسی حکومت کی سرپرستی میں چلتا ہے یا سرمایہ داروں کے بل پر۔ پھر یہ ادارہ ایک غلام ملک اور سامراجی دور میں تشکیل پاکر اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ اس کا ارتقا وقت کے عام رجحان کے خلاف ہوا، اور اس نے رجحان زمانہ کو بدل دیا۔ علمی سطح پر یہ ایک بے نظیر انقلاب آفرینی تھی جو عہد آفرین ثابت ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ بیسویں صدی میں سیاسی، معاشی اور صنعتی تقاضوں کے برخلاف مشرق کی محیر العقول نشاۃ ثانیہ کا ایک اہم ترین نشان دارالمصنفین اعظم گڈھ ہے۔ لیکن برصغیر کی آزادی اور تقسیم کے وقت اس کی بقا ایک سوالیہ نشان بن گئی۔ اس بحرانی دور میں اس کے بانی، علامہ سید سلیمان ندوی، اس کے تحفظ کا ابتدائی سامان کرکے دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اور ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا۔ جس کا پر کرنا محال نظر آنے لگا۔

اس امر محال کو ممکن بنانے کے لیے سب سے پہلے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم سامنے آئے۔ اور کتابوں کی اشاعت سے "معارف" کی ادارت تک انھوں نے دارالمصنفین کی مسلسل زندگی اور ترقی کی توقعات پیدا کیں۔ لیکن وہ بھی بہت جلد دنیا سے رخصت ہوگئے اور یہ سوال پھر پیدا ہوگیا کہ اب کیا ہوگا۔ کون جانشین ہوگا اور طوفان حوادث میں کشتی کی ناخدائی کرکے اسے ساحل مقصود کی طرف کون لے جائیگا؟ جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم اس سوال کا جواب بن کر سامنے آئے۔ وہ اپنے پیش رووں کی طرح سند یافتہ عالم دین اور عربی وفارسی تو کیا، اردو کے بھی فارغ التحصیل نہیں تھے، انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم۔ اے کیا تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے ہم وطن تھے اور ان کے زیر تربیت تصنیف وتالیف میں مشغول لیکن جب انھوں نے معارف کی ادارت سنبھالی اور اس کے شذرات لکھنے لگے تو محسوس ہوا کہ دارالمصنفین کا آسمان ابھی ستاروں سے خالی نہیں ہوا۔

ایک طرف بزم تیموریہ سے بزم صوفیہ تک جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن کی تصنیفات و تالیفات اور دوسری طرف ان کے قلم سے ہر ماہ نکلنے والے معارف کے شذرات نے اردو دنیا کو یقین دلادیا کہ نہ تو شبلیؒ کا خواب گم ہوا ہے، نہ سید سلیمان ندویؒ کی تعبیر ختم ہوئی ہے، نہ شاہ معین الدین احمد ندوی کی کوششیں رائیگاں گئی ہیں۔ چنانچہ دار المصنفین کا نظام شمسی اب سید صباح الدین عبد الرحمٰن کی ذات سے وابستہ ہو کر گردش کرنے لگا۔ ماہ و سال گزرتے رہے، بیسویں صدی اپنی آخری دہائی کی طرف بڑھتی رہی اور دار المصنفین اپنے منصوبہ و مقدر کی تعمیل و تکمیل کرتا رہا۔ اس عظیم الشان ادارے کا وقار برقرار رہا۔ اس کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ اس کی خدمات کا تسلسل قائم رہا۔

پچھلے دس بارہ سال میں راقم السطور کو مرحوم سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع بار بار اور مختلف جہتوں سے ملا۔ اکثر و بیشتر ان سے ملک کے علمی و ادبی جلسوں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں اور بعض وقت تھوڑی دیر کے لیے ساتھ سفر کرنے کا اتفاق بھی ہوا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ پٹنہ آئے یا یہاں سے گزرے تو بالعموم ملے۔ اور بار ہا دیر تک ساتھ رہے، باتیں کیں، بحثیں کیں۔ کچھ معاملات کے سلسلے میں ان کے خطوط بھی آتے رہے۔ خاکسار کے چند مضامین معارف میں شائع کیے اور خاص کر اس کی دو کتابوں پر مبسوط تبصرے کیے جن میں ایک "اقبال کا نظام فن" پر پورا تنقیدی مقالہ بن گیا۔ جس میں بہت زیادہ توصیف و تحسین کے ساتھ کچھ "چھیڑ چھاڑ" بھی تھی۔ لیکن جب اس چھیڑ کا قدرے مفصل جواب مصنف نے دیا تو ایک مکتوب میں مدیر معارف نے ایسے تفہیم کی کہ اشاعت پر اصرار نہ کیا جائے۔

ان باتوں سے محسوس ہوا کہ جناب سید صباح الدین عبد الرحمان مرحوم ایک بہت حساس، رقیق القلب، مخلص اور گرم جوش انسان ہیں۔ بزرگوں کے نہایت عقیدت مند ہیں

اور عزیزوں کے ساتھ حد درجہ شفیق، گفتگو میں اپنا نقطہ نظر پورے زور سے پیش کرتے ہیں اور بعض وقت چبھتا ہوا انداز اختیار کرتے ہیں۔ جس سے محفل میں ایک تاثر پیدا ہوتا ہے اور لوگ اس نکتے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جو اٹھایا گیا ہے۔ مرحوم کے مضامین میں ثقاہت اور بشاشت کا وہی امتزاج ہے جو دبستان شبلی کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔

اس دبستان کے بانی سے مرحوم کی عقیدت ۲ ستمبر ۱۹۸۶ء کے اس خط سے بھی آشکارا ہے جو راقم السطور کے نام دار المصنفین میں شبلی کی تنقید نگاری پر توسیعی لکچر کا دعوت نامہ ہے۔

"میرا خیال ہے کہ آپ مولانا شبلی بحیثیت نقاد کے موضوع پر مقالہ لکھیں تو زیادہ بہتر ہو۔ لیکن یہ مقالہ ایسا ہو کہ ایک چھوٹے سے رسالہ میں شائع بھی کیا جاسکے یعنی مختصر نہ ہو۔ پھر یہ واضح رہے کہ دار المصنفین کا پلیٹ فارم ہوگا۔ اس لیے اس میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو مولانا شبلی کی علمی و ادبی شان کے خلاف ہو۔ ظاہر ہے کہ آپ اس کا خود خیال رکھیں گے۔"

جس چیز نے مجھے یہ دعوت قبول کرنے پر آمادہ کیا وہ اقتباس کا آخری جملہ ہے۔ جس سے مکتوب الیہ پر اعتماد اور اس کے ساتھ خلوص کا اظہار ہوتا ہے، ورنہ مرحوم نے مجھ سے خود اپنی آخری ملاقات میں، جو جناب سید شہاب الدین دسنوی کے مکان پر پٹنہ میں ہوئی تھی۔ بتایا کہ اردو کے ایک بزرگ ترین نقاد شاید "مولانا شبلی کی علمی و ادبی شان کے خلاف" کچھ نہ کہنے کی پابندی پر گویا اتنے خفا ہوئے کہ انھوں نے دعوت نامے کا جواب نہیں دیا۔ بہرحال، جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن کے الفاظ۔ مولانا شبلی کے ساتھ ان کی عقیدت میں غلو کے باوجود، اشارہ کرتے ہیں کہ مرحوم نے کس محبت اور محنت کے ساتھ اپنے وقت میں دار المصنفین اور اس کے مکتبۂ فکر کی حفاظت و حمایت اور خدمت کی۔

پوری نصف صدی تک اپنے تمام ذہنی وجسمانی قویٰ مشرق کے اس مایہ ناز ادارے کی آبیاری وشادابی پر صرف کرتے رہے اور مرکر بھی اسی کی خاک میں دفن ہوئے۔ یقیناً یہ ایک ایسے جنون عشق کا انداز ہے جو اقبال کے لفظوں میں عقل کے چاک بھی سیتا اور کارساز ہوتا ہے۔ اپنے ایسے مجنوں کی رحلت پر دارالمصنفین کا مستقبل ایک بار پھر سوال کر رہا ہے:

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق ؟
لب ساقی پہ مکرر ہے صلا میرے بعد ! (غالب)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کی چند تصنیفات

نمبر شمار	تصنیفات	پیسہ	روپیہ	نمبر شمار	تصنیفات	پیسہ	روپیہ
۱	بزم تیموریہ جلد اول	۰	۲۳	۹	ہندوستان کے سلاطین علما و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر	۰	۱۸
۲	" دوم	۰	۲۳				
۳	" سوم	۰	۲۳	۱۰	ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	۰	۱۲
۴	بزم مملوکیہ	۰	۲۵	۱۱	ظہیر الدین محمد بابر ہندو مسلم مورخین کی نظر میں	۰	۳۸
۵	بزم صوفیہ	۰	۴۲	۱۲	ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں اول	۰	۱۸
۶	ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک	۰	۳۶	۱۳	" " " دوم	۰	۱۶
۷	ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام	۰	۳۳	۱۴	صوفی امیر خسرو	۰	۱۶
۸	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے	۰		۱۵	غالب مدح وقدح کی روشنی میں اول	۰	۳۱
		۰	۴۳	۱۶	" " " دوم	۰	۳۸

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحبؒ کی وفات

پر

تعزیتی تار، تجاویز اور خطوط

دیسٹرن کورٹ کمرہ نمبر ۴۲ نئی دہلی

۱۹ نومبر ۱۹۸۷ء

عزیز محترم۔ اصلاحی صاحب

مرحوم سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے سانحے کی اطلاع آج صبح قومی آواز دہلی ایڈیشن سے اچانک ملی، اس وقت لکھنؤ گھر پر فون کیا وہاں سے خبر ملی کہ مرحوم سید صاحب راقم السطور سے ملنے غریب خانے پر تشریف لا رہے تھے (جیسا کہ قومی آواز لکھنؤ میں چھپا ہے) جب ہی یہ حادثہ ہوا۔ کیا عرض کروں کہ ایسے شفیق بزرگ کا ان حالات میں ہمارے درمیان سے اٹھ جانا کس درجہ دلخراش صدمہ ہے، آپ سب کے لیے تو ان کی جدائی ایک قائد اور رہبر ادارہ کی جدائی ہے، میرے لیے ایک اور ایک ہی ایسا بزرگ اٹھ گیا، جو محبوب بھی تھا، اور شفیق بھی ان کا مکرمت نامہ اعظم گڈھ سے روانگی سے قبل آیا تھا، کہ لکھنؤ آ رہے ہیں، اور غریب خانہ پر بھی تشریف لائیں گے، میں نے سمینار کے بعد جو ۱۲ نومبر کو ختم ہوا، مرحوم کا برابر انتظار کیا۔ اور اس کا خیال بھی رہا کہ ندوے سے فرنگی محل تک آنے میں ان کو زحمت ضرور ہوگی۔ میں خود اپنی بعض مجبوریوں کی وجہ سے ان کی خدمت میں ندوہ نہ پہنچ سکا، تا آنکہ ۱۷ نومبر کو لکھنؤ سے دہلی روانہ ہونے کے دن میں نے ایک عریضہ ان کی خدمت میں اعظم گڈھ ارسال کر دیا کہ کچھ دنوں کے لیے باہر جا رہا ہوں (کراچی)، واپسی میں انشاء اللہ نیاز حاصل کروں گا، افسوس کہ اب یہ حسرت اس دنیا میں حسرت ہی رہ گئی

مرحوم کے صاحبزادگان کے ناموں سے میں بدقسمتی سے واقف نہیں ہوں۔ آپ زحمت فرماکر بوحدتِ مضمون ان سے اور دیگر پس ماندگانِ خاندان سے میری طرف سے تعزیت کا فرض انجام دے دیں۔

میں جب یہ لکھ رہا ہوں کہ وہ میرے تنہا شفیق رہ گئے تھے، تو اس میں کم از کم آپ کو جو کسی حد تک سید صاحب مرحوم کے میرے حال پر شفقت فراواں سے واقف ہیں ذرا بھی مبالغہ نظر نہ آئے گا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے، اور ادارہ پر اپنا فضل فرمائے کہ وہ مرحوم کے کاموں کو ان کے منشا اور پروگرام کے مطابق انجام دے سکے، اللہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق بخشے، میں یہی عرض کر سکتا ہوں کہ آپ حضرات کے علمی کاموں میں میرے لائق جو خدمت ہوگی یا سپرد کی جائے گی، اس کے لیے حاضر ہوں۔

بڑا سانحہ ہوا۔ اس نازک دور میں سید صاحب مرحوم کا رخصت ہو جانا! اس وقت ہر وہ ہستی قیمتی ہے، جو تقسیم ہند کے پہلے سے ملکی اور معاشرتی معاملات میں ملی پہلو سے وابستہ رہی ہے، ان ہستیوں میں سید صاحب مرحوم بلاشبہ صف اوّل کے لوگوں میں تھے۔

آپ کے غم میں شریک

محمد رضا انصاری

قاضی منزل، قاضی اسٹریٹ، میرٹھ

۱۹ر نومبر ۱۹۸۷ء

مکرم و محترم السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو۔ آج کے اخبار سے محب محترم ادیب اریب مولوی سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کی ناگہانی وفات حسرت آیات کی خبر معلوم ہوئی، دماغ پر بجلی سی گری اور بے اختیار آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

انھوں نے رسالہ "معارف" اور دارالمصنفین کے ذریعہ، اردو ادب، تاریخ و تصوف کے موضوعات پر جو گل فشانیاں اور جواہر ریزیاں کیں وہ ان کے نام کو ہمیشہ روشن رکھیں گی، اور تاریخ ادب اردو کے صفحات ان سے جگمگاتے رہیں گے۔ وہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کے عزیز و صحیح جانشین تھے، ان کے اور ان کے تلمیذ رشید مولینا شاہ معین الدین کے بعد انھوں نے رسالہ معارف کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور ان کو بڑے سلیقہ اور لیاقت کے ساتھ انجام دیا۔ اور اس کے بلند معیار کو گرنے نہ دیا۔

انھوں نے علمی و تاریخی و دینی موضوعات پر کئی درجن کتابیں لکھیں جو ان کے نام کو ہمیشہ تاریخ ادب اردو کے صفحات پر تابندہ و درخشندہ رکھیں گی۔ چند سال قبل انھوں نے اعظم گڈھ میں اسلام اور داعی اسلام ﷺ کے خلاف مستشرقین کے بیہودہ الزامات کا پردہ چاک کرنے کے لیے جو بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی اس میں حاضری کے موقعہ پر ان کے سلیقہ، ان تھک محنت اور جذبہ خدمت علم و دین کا مشاہدہ ہوا، اور دل سے ان کے لیے دعا نکلی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی ان بیش قرار خدمات کو درجہ قبول عطا فرمائے، اور جنت الفردوس میں ان کے مراتب بلند کرے۔

کئی سال گزرے، ان کو اور مجھے ایک ساتھ صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے علی الترتیب فارسی اور عربی کے اعزازات ملے تھے، اس موقعہ پر انھوں نے از راہ انکسار لکھا کہ میں آپ کا ردیف ہوں؛ میں نے جواب دیا کہ "ردیف نہیں آپ میرے الیف ہیں"۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ کاملۃ شاملۃ۔ میری طرف سے رفقاء و کارکنان دارالمصنفین کو سلام و تعزیت پیش کر دیں، میں بھی صاحب فراش ہوں اور طالبِ دعا۔

والسّلام

زین العابدین غفر اللہ لہ

مرکز جماعت اسلامی ہند دہلی

۲؍دسمبر ۸۶ء

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ اعظم گڈھ سے ہم ۱۰؍نومبر کی شب لکھنؤ پہونچے اور ۱۱ کی شب دہلی۔ چاہتا تھا کہ مولانا صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے نام شکریہ کا خط لکھوں لیکن انتہائی مصروفیت اور ۱۴ ہی کو پنجاب کے دورے پر نکلنے کے پروگرام نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ اور پھر سفر میں بھی بات ٹلتی رہی، جب ۲۲؍نومبر کی شب دہلی لوٹا تو مولانا رفیق قاسمی صاحب امیر حلقہ اترپردیش موجود تھے۔ ان کی زبانی مولانا مرحوم کے سانحۂ ارتحال کی اطلاع ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آنکھیں نم ہوگئیں اور دل بھی رنج وغم سے بھر گیا۔ اللہ تعالےٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے، اہل خانہ اور متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

مولانا سے غائبانہ تعارف تو ایک عرصہ سے حاصل تھا لیکن ۱۹۸۴ء سے شخصی تعارف اور تعلق کا آغاز ہوا۔ جب کبھی مرحوم دہلی تشریف لاتے تو مرکز ہی میں قیام ہوتا۔ مولانا کی تصنیفات سے استفادہ کرتا رہا ہوں۔ سفر اعظم گڈھ کے موقعہ پر مرحوم کی "بزم رفتگاں" زیر مطالعہ تھی جس کو ابھی ابھی ختم کیا ہے۔

براہ کرم میرے احساسات اور جذبات اہل خانہ تک پہونچادیں۔ مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند اور مولانا افضل حسین صاحب قیم جماعت اسلامی ہند بھی بڑے گہرے جذبات کا اظہار فرمارہے تھے۔ خط کی رسید کا انتظار رہے گا۔

والسلام

مخلص

محمد سراج الحسن سکریٹری جماعت اسلامی ہند

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

۲۲؍دسمبر ۸۶ء

مکرمی جناب عبیداللہ کوٹی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کل گرامی نامہ ملا۔ محترمی مولانا سید صباح الدین عبدالرحمن کے سانحۂ ارتحال کی خبر اخبارات میں پڑھی۔ بڑا صدمہ ہوا۔ ۹؍نومبر کو آپ سب حضرات کے ساتھ ان سے بھی ملاقات ہوئی تھی، کسے توقع تھی کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہوگی۔

آپ نے صحیح لکھا ہے کہ وہ دارالمصنفین کی آبرو اور اس کی پچھلی روایات کے امین تھے، اس کے آگے کی بات یہ کہ ان کی وفات دارالمصنفین ہی کے لئے نہیں پوری علمی دنیا کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے۔ ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے، آپ ہی حضرات کو اسے پُر کرنا ہے، مولانا ضیاء الدین اصلاحی سے بھی میری طرف سے تعزیت فرمادیں، اب مولانا محترم اور آپ سب کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں، اللہ تعالےٰ مدد فرمائے۔

محترم سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب سے چند بار ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ ہر بار ان کے علم وفضل کے ساتھ ان کی خاکساری، تواضع اور محبت کا بھی دل نے اثر قبول کیا، اللہ تعالےٰ مغفرت فرمائے، اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

مولانا ضیاء الدین صاحب اور سب ہی رفقائے دارالمصنفین کی خدمت میں سلام مسنون عرض کریں۔

جلال الدین

مرادآباد - ۲۱؍دسمبر ۸۶ء

حضرت محترم مولانا ضیاء الدین اصلاحی۔ دام مجدہم

حضرت شہید مولانا سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے شرف کے ساتھ جدائی ہوئی۔ مگر اس قدر غم و صدمہ ہے کہ الفاظ سے اسے ادا کرنا ممکن نہیں۔ پچھلے عریضہ کے ساتھ ان کے دو آخری خطوں کی فوٹو کاپی ارسال کی ہے، دعا مانگتا ہوں خدا کرے ایک بار قبر مبارک پر حاضری نصیب ہو جائے۔ ندوہ میں ان سے سب باتیں خوب دل کھول کر ہوتی رہیں۔ بس اس کا غم ہے کہ ایسے مشفق انسان سے محروم ہو گیا۔ حضرت سید الملت اور حضرت شاہ صاحبؒ کی جدائی کا غم تازہ ہو گیا۔

دارالمصنفین اور حضرت سید شہید کے لیے حجاز پاک کے حضرات کو بھی لکھا ہے، اور ابھی ہندو پاک کے بزرگوں کو لکھ رہا ہوں۔ حق تعالےٰ تخریبی ظالموں سے بھی نجات عطا فرمائے۔

اگر میرا پچھلا عریضہ اور حضرت شہید کے دونوں خط معارف میں دیدیں تو اچھا ہے۔

دوسری عرض یہ ہے کہ حضرت شہید نے سفر حجاز کا سفرنامہ لکھ لیا تھا، جو معارف میں شائع نہیں ہوا ہے۔ براہ کرم ان کے کاغذات سے تلاش کر کے اسے دسمبر کے معارف میں ضرور دیدیجے انشاء اللہ اس کا شائع ہونا اہل حجاز کی توجہ دعا کا ذریعہ بنے گا۔ اس میں کوتاہی نہ فرمائیں۔

میرے پاس بھی حضرت کے چند خط ہیں، اگر معارف میں دینا چاہیں تو ارسال کردوں، حضرت شاہ معین الدین صاحبؒ کی سوانح لکھ رہے تھے، اب دونوں حضرات کے سوانح مکمل کر کے شائع فرمائیں۔ شاہ صاحب کا سفرنامۂ حجاز بھی اس میں دینا حضرت شہید نے اسے منظور فرما لیا تھا۔

ایک درخواست یہ ہے کہ مولانا عبید اللہ کوٹی صاحب کی طلب پر جو کتابیں ارسال کی تھیں ان میں سے حجاز مادر، سے حجاز مولانا عبد الملک مدنی صاحب کے ارشادات و مکتوبات مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی دل کی باتیں جو حضرت شہید کی کتابوں میں ملیں گی، ان پر معارف میں

تبصرہ ضرور فرما دیں بڑا کرم ہوگا۔

حضرت سید شہید نے لکھنؤ میں فرمایا تھا کہ ان کی تصنیف صوفیائے کرام پر اور آخری حضرت سید الملت کی تصانیف پر مجھے عنایت فرمائیں گے۔ اگر آپ عنایت فرما سکیں تو حضرت کی روح خوش ہوگی انشاء اللہ۔

دعا کی درخواست ہے آپ کے ذریعہ حضرت کے خانوادے مخدومہ اہلیہ صاحبہ، صاحبزادگان و صاحبزادیوں اور دارالمصنفین کے حضرات سے ایک دفعہ حاضر ہو کر دل کی بھڑاس نکالوں اور حضرت کی روح کو خوش کرنے کا ذریعہ بنوں سب سے سلام عرض ہے۔

والسلام خادم افتخار فریدی مراد آباد

جامعہ سلفیہ بنارس

۲۷ دسمبر ۸۷ء

محترمی و مکرمی جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب

حفظہ اللہ وتولاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

امید کہ بخیر و عافیت پہونچ گئے ہوں گے، لکھنؤ میں اچھی ملاقات رہی، متعدد علماء و محققین سے نیاز حاصل ہوا، اس طرح کے اجتماعات کا یہ فائدہ بھی اہم ہے۔

مصائب میں کچھ کہا نہیں جا سکتا، سب کچھ اللہ تعالےٰ کے حکم و ارادہ سے ہوتا ہے، لیکن ۸۷ء کے آخری دو مہینے بڑے صبر آزما حالات لیکر آئے، پہلے مولانا سید صباح الدین عبد الرحمٰن کی وفات کا رنج پہونچا۔ اور اس کے بعد پروفیسر نور الحسن انصاری کا انتقال ہوا موخر الذکر سے رشتہ تھا۔ اور اول الذکر سے علمی و تحقیقی میدان کی عقیدت، دونوں عالم

محقق تھے، اور علم و تحقیق کا مشغلہ رکھنے والوں کے رہنما، جانا سب کو ہے، لیکن جدائی کا رنج بھی فطری ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ ہم لوگوں کو صبر ہو، اور مرحومین کو وہ اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

لکھنؤ میں امام ذہبی کے رسالہ کا ذکر آیا تھا، شیخ ابو زہرہ نے اپنی کتاب ابن تیمیہ میں اسکی حقیقت ظاہر کی ہے، یہ غلط طور پر ذہبی کی طرف منسوب ہے، اور النصیحۃ الذہبیۃ کسی اور کا رسالہ ہے، ابو زہرہ کی کتاب یا اس کا اردو ترجمہ ہو تو ملاحظہ فرمالیجئے۔

پچھلے سمینار کے مقالات پر مشتمل مطبوعہ کتاب اور بعض دیگر مطبوعہ چیزیں ارسال ہیں، وصول فرماکر مطلع فرمائیں تو نوازش ہوگی۔

محترم جناب مولانا عبید اللہ کوٹی صاحب کو سلام و خلوص عرض ہے،

محترم ڈاکٹر حمید اللہ (پیرس) کا مجھے پتہ مطلوب ہے، اگر مرحمت فرمائیں تو علمی معاونت ہوگی۔

والسلام

مقتدیٰ حسن ازہری

محلہ خواجہ ہال رودولی۔ بارہ بنکی

۱۹ نومبر ۱۹۸۷ء

محترم منیجر صاحب دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سلام مسنون

چار و ناچار محترم مرحوم کے لیے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ تو لکھنا ہی پڑا، اور دعا مغفرت کیلئے ہاتھ بھی پھیلائے۔ لیکن آپ حضرات کو تسلی دینے کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں، جس شمع آگہی کی بہت اور بہت دیر تک ضرورت تھی۔ وہ روشنی نہ رہی، محو حیرت ہوں کہ

اب کیا ہوگا۔ اللہ آپ سب کو صبر کی ہمت و توفیق عطا فرمائے متعلقین متوسلین کو پرسہ دیجئے، میری جانب سے دونوں لڑکوں اور دونوں لڑکیوں اور ان کی امی کی خدمت میں تعزیت پیش کیجئے۔ اور کلمات صبر کی تلقین کیجئے۔

بگیتی گر کسے پایندہ بودے — ابوالقاسم محمدؐ زندہ بودے

انتہائی سوگوار سید شاہ محمد احمد قادری

اقبال، رودلوی

درگاہ شریف، رودولی بارہ بنکی

۲۸ نومبر ۱۹۸۷ء

مکرمی! تسلیم و تکریم

روزنامہ قومی آواز لکھنؤ سے سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے اچانک انتقال کی روح فرسا خبر معلوم ہوئی۔ بڑا دکھ ہوا۔ بڑا رنج ہوا، بڑا قلق ہوا، سکتہ سا ہوگیا سید صاحب مرحوم دریائے علم کے بے مثل شناور تھے تحقیق کے میدان کے مرد میدان تھے، بے نظیر صحافی اور ادیب تھے، اور ساتھ ہی ساتھ ایک معتبر مورخ تھے، اگر میں یہ کہوں کہ مرحوم تنہا دارالمصنفین تھے، تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔ وہ دبستان شبلی کے لعل شب چراغ تھے۔ انھوں نے جس خلوص، جس لگن سے دینی اور علمی خدمت کی ہے، اسے ہر صاحب نظر قدر کی نگاہ سے دیکھے گا۔ انھوں نے اس سلسلہ میں جو چمن کھلائے ہیں۔ ان کے پھولوں کی مہک ان کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھے گی سید صاحب خشک سے خشک موضوع پر بھی قلم اٹھاتے تھے تو اس میں رعنائی اور دلکشی پیدا کر دیتے تھے۔ مرحوم نے نرم دم گفتگو گرم دم جستجو کو اپنا شعار بنالیا تھا۔

مرحوم اس شعر کی زندہ تفسیر تھے۔

درعشق غنچہ ایم کہ لرزد زباد صبح   درکار زندگی صفت سنگ خارایم

صباح الدین صاحب مرحوم نہایت خلیق، بامروت اور وضعدار انسان تھے۔ اتنی بلندی پر پہنچنے کے بعد بھی وہ اپنے کو والا مرتبت قسم کا آدمی نہیں سمجھتے تھے۔ ان میں انکساری تھی۔ اور یہ بات تصوف سے گہری وابستگی کی بنا پر اُن میں آئی۔ مرحوم جب بھی ردولی تشریف لاتے تو میرے غریب خانہ پر ضرور تشریف لاتے۔ چونکہ میرے ماموں شاہ آفاق احمد مرحوم سجادہ نشین حضرت شیخ احمد عبدالحقؒ ردولوی سے ان کے نہایت برادرانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ لہذا ماموں صاحب کے انتقال کے بعد بھی انھوں نے اپنی یہ وضع برقرار رکھی۔ مرحوم اگلی شرافت کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ خدا مرحوم کی قبر کو نور سے بھردے اور اپنے یہاں بہتر سے بہتر جگہ دے۔ آپ حضرات مجھے اپنے غم میں برابر کا شریک سمجھیں۔

شریک غم اقبالؔ ردولوی (شاہ اقبال احمد)

صابری قدوسی

مدراس

۴؍نومبر ۸۷ء

محترمہ بیگم صاحبہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آج شہاب الدین دسنوی کا خط آیا کہ عالی جناب سید صباح الدین صاحب حادثے کا شکار ہوگئے، یہ کچھ نہیں لکھا کہ کیا ہوا آج دوپہر ایک دوست مجھ سے ملنے آئے بتایا کہ آپ رکشہ میں جارہے تھے، بس یا کوئی گاڑی نے ٹکر دی جس کی وجہ سے ان کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سید صباح الدین ہم سب کے ہردلعزیز تھے۔ آپ کے لیے اور آپ کے بچوں کے لیے یہ صدمہ ایک صدمہ جانکاہ ہے، جو برداشت کے قابل نہیں ہے۔ آپ نے اسلامی علوم وفنون اور خاص کر ہندوستانی تاریخ کی بڑی خدمت کی ان کی کتابیں دوسرے ریسرچ کرنے والوں کے لیے رہنما ہیں۔ ان کا جتنا بھی ماتم کیا جائے وہ کم ہے۔ نہیں معلوم اللہ تعالےٰ کی کیا مصلحت تھی کہ ان کو ہم سے دفعتاً چھین لیا۔ اب ہمارے لیے دعائے مغفرت کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ آپ سے ہم جیسے غمخواروں کی درخواست ہے کہ اس پر صبر کریں اور اپنے بچوں کو بھی صبر کی تاکید کریں، میری بیوی بھی آپ کی خدمت میں اور آپ کے بچوں کی خدمت میں دلی تعزیت ادا کر رہی ہیں۔ نومبر کے معارف میں شاید تفصیل ہوگی۔ اور ہم کو معلوم ہوگا۔ کہ یہ حادثہ کیونکر ہوا۔ اور کیسے ہوا۔

غمگسار

محمد یوسف کوکن و بیگم محمد یوسف کوکن

۲۹؍نومبر ۸۷ء

محترمان گرامی قدر، سلام مسنون کے بعد مطالعہ فرمائیں۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن مدیر معارف کے سانحۂ ارتحال کی خبر سنی۔ سخت صدمہ ہوا۔ تفصیل بعد کو معلوم ہوئی، جس کو سنکر صدمہ میں اضافہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین

مرحوم سے سہارنپور اور لکھنؤ میں دو چار مختصر ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ان ہی ملاقاتوں سے مرحوم کے اخلاق حمیدہ اور کمالات علمیہ کا اندازہ ہوگیا تھا۔ لکھنؤ میں ان کی ایک تقریر بھی سنی تھی، وہ بھی ان کی تحریر کی طرح

فصیح و بلیغ تھی، ان کی جتنی تحریریں پڑھنے کا اتفاق ہوا، ان سے ان کے ذوق تحقیق اور جستجوئے علم و فن کا پتہ چلا۔ انھوں نے اطہر شیبی کی کتاب پر جو اس نے تاقو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی حیثیت لکھی تھی۔ اور حضرت والا کی مقدس ذات پر سخت بے باکانہ اور گستاخانہ حملہ کیا تھا۔ بہت عمدہ معرکۃ الآرا، اور دندان شکن تبصرہ فرمایا تھا۔ اسی تبصرہ سے میرے دل میں ان کی شخصیت کی عظمت زیادہ ہو گئی تھی۔ میری طرف سے مرحوم کے پسماندگان کو تعزیت کے چند کلمے لکھکر پہنچا دیں۔ مجھے مرحوم کے وطن کا پتہ معلوم نہیں ہے۔ اگر ان کے اہل و عیال اعظم گڈھ میں ہوں تو میری یہ تحریر وہاں تک پہونچا دیں۔

دارالمصنفین اور معارف کے تمام کارکنان اور معاونین بھی اس الم ناک حادثہ پر تعزیت کے مستحق ہیں۔ میں ان سب کی خدمت میں بھی تعزیت پیش کرتا ہوں۔

والسّلام

نسیم احمد فریدی امروہی عفرلہٗ

بقلم فخر الاسلام

دارالسّلام

مالیر کوٹلہ۔ پنجاب۔ ۲۴ نومبر ۸۷ء

مکرم و محترم جناب منیجر صاحب دارالمصنفین اعظم گڈھ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

محترم سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مدیر معارف کے حادثۂ وفات سے ہم سب کو گہرا صدمہ ہوا ہے۔ موصوف ایک عالم، محقق اور صاحب طرز ادیب تھے۔ علمی دنیا میں ان کی وفات سے ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ انگریزی زبان پر ان کو مکمل عبور حاصل تھا۔ اس ضعیفی اور

عمر کی اس منزل میں بھی ان کے علمی انہماک میں کوئی کمی نہ تھی۔ گذشتہ دو سال پہلے اسلام آباد کی انٹرنیشنل قرآن کانگریس میں ان کے ساتھ ایک ہفتہ قیام کرنے کا موقع ملا، ان کی سادگی اور منکسر المزاجی اور اخلاق عالیہ سے میں بے حد متاثر ہوا۔

ان کی وفات پوری علمی برادری کے لیے ایک حادثہ ہے۔ جامعہ دارالسلام مالیر کوٹلہ کی طرف سے بھی اور ذاتی طور پر بھی میں انکے تمام متعلقین اور کارکنان دارالمصنفین کی خدمت میں اظہار تعزیت کرتا ہوں۔ اور موصوف کے لیے بلندی درجات کی دعا کرتا ہوں۔

والسّلام

فضیل ہلال مفتی مالیر کوٹلہ وشیخ الجامعہ دارالسّلام مالیر کوٹلہ

کلکتہ

۳۰ نومبر ۸۷ء

بخدمت ارکان دارالمصنفین۔ اعظم گڈھ

ایک سال میں دو مایہ ناز مسلم علمائے ہند یعنی مولانا سید کلب عابد صاحب اور مولانا سید صباح الدین صاحب کا انتقال اور دونوں کا موٹر کار ہی کے حادثات میں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بیحد جانگداز ہے، دونوں اودھ کے علاقے کی ہی مایۂ ناز شخصیتیں تھیں۔ جن کی کمی پوری نہیں ہو سکتی۔

حضرت مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے سانحۂ ارتحال کی افسوسناک خبر آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے حلقوں میں بھی باعث تکلیف و غم ہے، حضرت مولانائے مرحوم کی بلند پایہ تصنیفات اور جلسوں میں حضرت کی تقریروں سے ہملوگ برابر استفادہ کرتے تھے، بالکل اپنے علما کی طرح انکو ہم سمجھتے تھے، ان کی تازہ تصنیف "بابری مسجد" موجودہ قضیہ میں ہملوگوں کے کام آرہی ہے، اور اس میں جو نادر معلومات نہایت کد و کاوش سے مولانا موصوف نے یکجا کر کے ہم لوگوں کو دی تھیں

اور جس کا فائدہ آجکل ہندوستان کے دانشور مسلمان اٹھا رہے ہیں، یہ مولانا صباح الدین صاحب اعلی اللہ مقامہ، کی زندگی کی آخری خدمات ہیں۔

حضرت مولانا نے، راقم الحروف کو ایک خط لکھکر بلایا تھا۔ اور دارالمصنفین میں ہی بابری مسجد سے متعلق دستاویزات دکھانے کی خواہش ظاہر کی تھی، ہمیں وہ اعظم گڑھ میں اپنا مہمان بنانا چاہتے تھے، افسوس کہ ہم ان کی دعوت سے بروقت فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اور وہاں جانے کے اپنے مصمم ارادہ کو دقتی عدیم الفرصتی کیوجہ سے ٹالتے رہے، آج قلق ہو رہا ہے۔

مولانا صباح الدین عبدالرحمن صاحب کی علمی لیاقت ان کے اخلاق ومحبت اور ان کی وسیع النظری کے ہم سب لوگ قائل و معترف ہیں، اللہ تعالے ان کو درجات اعلی سے نوازے یہ ہم لوگوں کی دعا ہے۔ اور ہم لوگوں کی طرف سے دلی تعزیت قبول کریں۔ ان کے اعزا اور اہل خاندان تک یہ تعزیت نامہ پہنچا کر ممنون کریں۔ فقط

انجم قدر

صدر آل انڈیا شیعہ کانفرنس

مدرسہ بدرالاسلام شاہ گنج، جونپور

۱۰ر نومبر ۸۷ء

مکرمی زید مجدہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۰ر نومبر کے قومی آواز کے ذریعہ یہ خبر وحشت اثر ملی کہ ناظم دارالمصنفین جناب صباح الدین عبدالرحمن صاحب کا ایک سڑک حادثہ میں انتقال ہو گیا۔ بہت صدمہ ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مرحوم عظیم مورخ کے ساتھ ایک بے نفس اور شریف انسان تھے، اپنے تحقیقی کمالات کی

بنیاد پر بین الاقوامی شخصیت کے مالک تھے، مجھ حقیر فقیر سے بھی تعلق اور محبت رکھتے تھے حضرت شاہ صاحب مرحوم سے مجھے جو تعلق تھا۔ اور ان کو مجھ سے جو محبت اور خلوص تھا۔ اس کو مرحوم نے باقی رکھا۔ چند سال پہلے دارالمصنفین میں مستشرقین کے عنوان پہ جو جلسہ ہوا تھا۔ اس میں ملاقات ہوئی تھی۔ بہت محبت سے ملے پھر جب شرکائے جلسہ کے اسماء معارف میں جلسے کی کارروائی کے ساتھ چھپے تو میرا نام بھی مدرسہ بدرالاسلام شاہ گنج کے مکمل پتہ کے ساتھ شائع فرمایا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے فرشتہ مزاج لوگ افسوس ہم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

مرحوم کی ناگہانی وفات سے ملک وملت کو بہت نقصان پہنچا اللہ تعالے دارالمصنفین پر رحم فرمائے۔ اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

والسّلام

عثمان احمد غفرلہٗ

الہ آباد

۴ر ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ

مشفقی المکرم زید مجدکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مکرم ومحترم مولانا صباح الدین عبدالرحمن صاحب کی وفات سے بہت رنج ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔ اور ہم سب کو صبر دے۔ چونکہ ان کے اعزہ کا علم نہیں۔ اس لیے آنمحترم کو یہ تعزیت نامہ ارسال کر رہا ہوں۔

والسّلام

محمد قمر الزمان۔ الہ آباد

دار العلوم فاروقیہ، کاکوری، لکھنؤ

۱۸ نومبر ۸۷ء

مکرم ومحترم جناب مولانا ضیاء الدین صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مرحوم سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب کی ناگہانی وفات نے صرف دار المصنفین کو ایک لائق ناظم اور معارف کو ایک دیدہ ور مدیر ہی سے محروم نہیں کیا۔ بلکہ ان کی وفات سے دبستان شبلی کی ایک نسل کا خاتمہ ہوگیا۔

ابھی چند ہی دن کی تو بات ہے کہ ۲ نومبر ۸۷ء کو مرحوم سے آپ کی معیت میں صبرحد میں ملاقات ہوئی تھی۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد دیر رات گئے تک مرحوم میرے پاس خاطر سے بڑی پر لطف گفتگو فرماتے رہے تھے، پھر صبح واپسی میں آپ تو صبرحد ہی میں رک گئے تھے اور میرا مرحوم کا شاہ گنج تک ساتھ رہا تھا۔ کیا عرض کروں کہ ان کی باغ وبہار شخصیت اور خورد نوازی کے جذبات نے کس قدر متاثر کیا تھا، میری تو مرحوم کے ساتھ اسقدر طویل رفاقت پہلی مرتبہ ہوئی تھی، آپ حضرات تو ان کے رفیق وہمدم تھے، آپ کو ان کے فراق کا جسقدر بھی صدمہ ہو کم ہے۔

مگر ضابطۂ خداوندی کل نفس ذائقۃ الموت کے مطابق ہمارا یہ صدمہ بھی عارضی ہے۔ ایک دن ہم کو بھی یہ دنیا چھوڑنا ہی ہے۔

چونکہ علمی طور پر سید صاحب کی وفات پر میں آپ ہی کو سب سے زیادہ مستحق تعزیت سمجھتا ہوں اس لیے یہ عریضہ آپ کے نام ارسال کرکے درخواست کرتا ہوں کہ میری طرف سے تمام ارکان ادارہ اور مرحوم کے جملہ ورثا کی خدمت میں بھی تعزیت پیش کر دیں۔

مدرسہ میں بھی قرآن خوانی اور ایصال ثواب کا اہتمام کیا گیا۔

والسلام

عبد العلی فاروقی، مدیر البدر کاکوری،

بمبئی

۵ دسمبر ۸۷ء

برادر گرامی قدر   سلام مسنون

خدا کرے ہر طرح بعافیت ہوں۔

مخدومی سید صباح الدین صاحب کے اچانک حادثہ سے شدید تکلیف ہوئی میرے ساتھ جوان کا خصوصی تعلق تھا اور جو ان کی مجھ پر جو شفقتیں رہا کرتی تھیں، اس کی ایک ایک ادا یاد آتی ہے۔ اور دل ٹوٹ جاتا ہے،

آپ کو بھی ان کی سرپرستی میں بڑی عافیت تھی، اب خدا جانے آگے کیا حالات درپیش ہوں۔ آپ کی صالحیت اور صلاحیت سے قوم وملت کو جو فیض پہنچا ہے، خدا کرے کہ اس کے راستہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو۔

ہم لوگوں کو اس حادثہ کی اطلاع بھی تاخیر سے ملی اور کئی دنوں تک دل ودماغ کی یہ حالت رہی کہ خط لکھنے کی بھی تاب نہیں رہی ہے آپ لوگ تو کافی خلا محسوس کر رہے ہوں گے، بلکہ ابتک زندگی اپنے معمول پر بھی نہیں آئی ہوگی۔

اب یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائیں اور آپ سے دار المصنفین کی خدمت اسی طرح لیں جو اس کی ۷۰ سالہ روایات کے مطابق ہے یہ بڑا آزمائشی دور ہے۔

اللہ تعالیٰ دار المصنفین کی اور آپ کی حفاظت فرمائیں، اور آپ لوگوں کو قوت وہمت دیں۔ (آمین)

آپ کا شریک غم۔ مستقیم احسن اعظمی۔

مبارکپور اعظم گڈھ

۲۳ نومبر ۸۷ء

جناب مولانائے محترم۔ زیدت معالیکم۔ اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ٹرک کے حادثہ میں جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ناظم دار المصنفین کے انتقال پر ملال کی خبر دار المصنفین سے محبت و تعلق رکھنے والے ہم تمام ہی لوگوں کے لیے سخت رنج و غم اور صدمہ کی بات ہے۔

دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عنایت فرمائے اور انکے خاندان سمیت آپ تمام ہی لوگوں کو صبر جمیل سے نوازے۔ (آمین)

دار المصنفین کے علمی ماحول میں مرحوم کے انتقال سے یقیناً ایک خلا پیدا ہوگیا ہے۔ لیکن اللہ کی ذات سے امید ہے کہ آپ حضرات کی علمی و تنظیمی کوششیں دار المصنفین کے وقار و اعتبار میں کوئی کمی نہ آنے دیں گی۔ اور یہ خلا انشاء اللہ جلد ہی پر ہو جائے گا۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

والسلام

جمیل احمد نذیری۔ "ایڈیٹر ندائے فضلا" مبارکپور

اعیان و مشاہیر علم و ادب کے خطوط

علماء کے خطوط کے بعد اب مشہور اصحاب علم و ادب کے خطوط شائع کئے جاتے ہیں۔

ہریانہ راج بھون چنڈی گڑھ

، دسمبر ۱۹۸۷ء

گرامی قدر۔ آداب نیاز!

سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کی ایک حادثے میں المناک انداز میں انتقال کی خبر نے میرے دل پر بڑا اثر کیا۔ مرحوم دار المصنفین اعظم گڈھ کے روح رواں اور شبلی اسکول کی آخری یادگار تھے، جن کی ادارت نے موقر جریدہ "معارف" کو اوج پر پہنچا دیا تھا۔ ان کی وفات سے اردو دنیا

ایک ممتاز محقق، مورخ اور مصنف سے محروم ہوگئی ہے۔ میں نے ان کی بیگم صاحبہ کو تعزیتی خط لکھا ہے۔ خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

میں ان دنوں مکاتیب اقبال پر کام کر رہا ہوں۔ میری یہ تالیف پانچ جلدوں پر مشتمل ہوگی۔ جس کی چار جلدیں اردو خطوط کی ہیں۔ اور پانچویں جلد میں انگریزی خطوط ہیں۔ متون کی تصحیح کے لیے میں نے علامہ اقبال کے اصل مکاتیب کے کافی عکس جمع کر لیے ہیں۔ اس سلسلے میں مرحوم سید صاحب کو میں نے ایک عریضہ لکھا تھا جس کی نقل ملفوف ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے نام علامہ اقبال کے ۔۔ مکاتیب اقبال نامہ (اوّل) (مرتبہ عطاء اللہ) اور طاہر تونسوی کی تصنیف "اقبال اور سید سلیمان ندوی" میں شائع ہو چکے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ اصل خطوط دار المصنفین، اعظم گڈھ میں محفوظ ہیں۔ اس لیے اب آپ سے درخواست ہے کہ آپ ان تمام خطوط کے عکس ارسال کر کے میری مدد فرمائیں۔ ان مکاتیب کے علاوہ اگر بعض نامور شخصیات کے نام علامہ کے مطبوعہ / غیر مطبوعہ خطوط بھی دار المصنفین میں موجود ہوں تو از راہ کرم ان تمام کے عکس بھی ارسال کر کے ممنون فرمائیں۔

خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔

مخلص

سید مظفر حسین برنی

گورنر ہریانہ

کلکتہ۔ ۲۳ نومبر ۱۹۸۷ء

محترم مولانا اصلاحی صاحب

مولانا سید صباح الدین صاحب کی وفات سے ہم سب کو انتہائی صدمہ پہنچا ہے۔

ان کی وفات جن اندوہناک حالات میں ہوئی، اس سے یہ غم اور بھی سوا ہو گیا ہے۔

مجھے مولانا مرحوم سے خاص عقیدت تھی۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد زندگی میں جو شفقت و محبت ان سے ملی وہ کسی اور سے نہیں ملی، وہ میری کامرانیوں کے لیے ہمیشہ دعا گو رہتے، آج میں جس مقام پر فائز ہوں یہ ان ہی کی دعاؤں کا اثر ہے۔

ایک عالم کی حیثیت سے ان کی شان بہت بلند تھی، علوم اسلامیہ میں ایسا محقق مشکل سے ملے گا۔ ان کا علمی سرمایہ آئندہ کام کرنے والوں کے لیے تردت کا سبب بنے گا، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک نہایت کریم النفس انسان تھے، ایسے شریف و وضع دار کو ہم برسوں ڈھونڈیں گے۔ مگر پھر بھی نہ پائیں گے۔ انکی ساری زندگی شاندار اور تابدار کاموں کے لیے وقف رہی۔ امید ہے کہ میرا ٹیلی گرام بھی آپ کو ملا ہوگا۔ میرے جذبات، مولانا کے پسماندگان اور شبلی اکیڈمی سے وابستہ تمام لوگوں تک پہنچا دیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ کلکتہ کے اخبارات میں ان کا بڑا ماتم ہوا، مغربی بنگال کے گورنر جناب سید نور الحسن نے بھی تعزیت کا اظہار کیا ہے۔[1]

والسلام

(جسٹس) خواجہ محمد یوسف

حبیب منزل، میرس روڈ علی گڑھ

۲۵ نومبر ۱۹۸۷ء

مکرمی و معظمی سید صاحب۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

آپ کا مکتوب مورخہ ۱۹ نومبر مجھے ابھی ملا۔ میٹنگ کل ہو گئی ہوگی۔ تعزیت کی تجویز پاس ہوئی ہوگی۔ بجٹ منظور ہو گیا ہوگا۔ اور دارالمصنفین کے انتظام و انصرام کا فیصلہ کیا ہوگا۔

[1] موصوف کا تعزیتی تار یہاں بھی آیا تھا۔

سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب مرحوم کے انتقال پُرملال کی خبر اخبارات ۱۹ نومبر کو مل گئی تھی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ بہت افسوس ہے۔ اللہ تعالےٰ غریق رحمت فرمائیں۔ (آمین)

اب آپ دارالمصنفین کا انتظام و انصرام کریں۔

والسلام

خاکسار عبید الرحمٰن

ہمدرد نگر

۲۸ نومبر ۱۹۸۷ء

مکرمی مولانا دسنوی صاحب

السلام علیکم

مولانا سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کا حادثہ ہم سب کے لیے صبر آزما ہے۔ مجھے تو کئی دن کے بعد اطلاع اوصاف صاحب نے دی، میرے کہنے پر انھوں نے لکھنؤ اور پٹنہ ٹیلیفون کرنے کی کوشش کی، لیکن نہیں ملا۔ تار کا مطلب واضح نہیں تھا۔ خط ۲۵ نومبر کو ملا جس سے وضاحت ہوئی۔ اس دوران میں میں سوچتا رہا کہ آپ کو کہاں خط لکھوں۔

پروفیسر فاروقی صاحب سے کچھ معلوم کرنے کا ارادہ کیا۔ تو ٹیلیفون پر معلوم ہوا کہ وہ تو عراق گئے ہوئے ہیں۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ لکھنؤ اور اعظم گڑھ گئے ہوئے ہوں گے۔ اوصاف صاحب بھی آج کل نہیں ہیں۔ امریکہ گئے ہوئے ہیں۔

اب آپ ذرا تفصیل سے بتائیے۔ کہ کیا صورت حال ہے۔ دارالمصنفین کا بوجھ فی الحال آپ پر ڈال دیا گیا ہوگا۔

آپ کا مخلص

عبد الحمید

جامعہ نگر، نئی دہلی

۴ر نومبر ۸۷ء

مکرمی جناب سید دسنوی۔ السّلام علیکم

میں راج ماتا۔ رامپور کے چہلم میں شرکت کے لیے رامپور گیا ہوا تھا۔ واپسی پر آپ کا تار اور خط ملے۔ ۴ر نومبر کے جلسہ میں میری شرکت بہت ضروری تھی۔ اور مجھے بیحد افسوس ہے، کہ میں شرکت سے محروم رہا۔ سید صباح الدین عبد الرحمٰن کو شہادت نصیب ہوئی۔ مگر ان کے چلے جانے سے دارالمصنفین کو سخت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اپنی علمیت نضیلت، اعلیٰ کردار کے علاوہ وہ ادارہ کی روحِ رواں تھے۔ اس کی خدمت کرنا ان کی زندگی تھی، ان کی عمر اور صحت کو دیکھتے ہوئے۔ میں ان سے ہمیشہ کہا کرتا تھا۔ کہ سید صاحب اپنا جانشین تلاش کر لیجیے۔ آپ کے دم سے یہ ادارہ چل رہا ہے، آپ کے بعد اس کا چلانا بہت دشوار ہو گا۔ اللہ تعالےٰ ان کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔ میں نے کئی مرتبہ کہا کہ آپ کی جگہ کے لیے میری رائے میں صرف سید شہاب الدین دسنوی موزوں ثابت ہونگے۔ ان سے کہیئے کہ وہ مستقل طور پر آپ کے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ آپ کو ناظم کے عہدہ پر کام کرنا بڑی ذاتی قربانی اور نامساعد حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ نہ معلوم ۴ر نومبر کے جلسے میں کیا طے پایا۔ براہ کرم مجھے جلسہ کی رُوئداد لکھوا کر بھیج دیں بیحد ممنون ہوں گا۔

دعا گو۔ بشیر حسین زیدی

سرسید نگر۔ علی گڑھ

۵ر دسمبر ۸۷ء

مکرمی و محترمی سلام مسنون

میں کئی ماہ قیام کے بعد یکم دسمبر کو انگلستان سے واپس آیا۔ یہاں پہنچ کر

صباح الدین صاحب کے سانحہ کا علم ہوا، بیان نہیں کر سکتا کہ دل پر کیا گزری۔ اب تک ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور کسی طرح یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ مجھ سے تقریباً چالیس سال سے مخلصانہ اور اب تو برادرانہ تعلق تھا۔ وہ مجھ پر بیحد اعتماد اور بھروسہ کرتے تھے، اور اپنے مسائل میں کھلے دل سے شریک کرتے تھے۔ انھوں نے دارالمصنفین کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں وہ کبھی فراموش نہ کی جا سکیں گی۔

آپ سے ان کا جو عزیزانہ تعلق تھا۔ اس کی بنا پر سوچا کہ آپ سے اظہار تعزیت کروں۔ اگر زحمت نہ ہو تو ان کے صاحبزادے اور صاحبزادی کے نام اور پتہ لکھدیں۔ میں براہ راست بھی ان کو لکھوں گا۔

آپ دارالمصنفین کو اپنے خاندانی بزرگوں کی امانت سمجھ کر وہاں قیام کا فیصلہ کر لیں۔ یہ زبردست قومی اور ملی خدمت ہوگی۔ ورنہ دارالمصنفین کو سیلاب بلا سے بچانا ممکن نہیں، شاید آپ کو اس کا علم ہو کہ میں نے صباح الدین صاحب کو پچھلی بار خود مشورہ دیا تھا۔ کہ وہ آپ کو اعظم گڈھ قیام پر مجبور کریں۔ انھوں نے مجھ سے اتفاق کیا تھا۔!

میں پچھلے کئی جلسوں میں شرکت نہ کر سکا۔ اس کا افسوس ہے، آپ پوری طرح یقین اور اعتماد کریں۔ کہ آپ کو جس طرح کے تعاون اور مدد کی ضرورت ہوگی۔ اس میں کوئی دریغ یا تساہل نہ ہوگا۔

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

خلیق احمد نظامی

یونیورسٹی روڈ۔ دہلی

حبیب مکرم و محترم السّلام علیکم

دسمبر کا معارف دیکھا۔ اور اس میں آپ کے شذرات پڑھے۔ آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

اور مخدومی صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کا غم پھر تازہ ہو گیا۔ یہ حادثہ کسی طرح بھی لائق صبر نہیں، لیکن انسان مجبور محض ہے، تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ۔ شذرات پڑھ کر خوشی بھی ہوئی کہ آپ کے یہاں علامہ شبلی کا سا رنگ و آہنگ اور مولانا سید سلیمان ندوی کا سا انداز نگارش بھی ہے۔ اور سادگی اور پرکاری بھی[1]۔ یار ما ایں دارد و آں نیز ہم، خدا کا شکر ہے، دار المصنفین کو اعظم گڈھ سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ سے لکھنؤ میں پہلی دفعہ ملاقات ہوئی۔ اور اب یہ شذرات پہلی دفعہ پڑھے۔ دل کا سودا کبھی کبھی ایک نیم نگاہ محبت سے بھی ہو جاتا ہے۔

خدا کرے ۸۸ء میں آپ کو دین و دنیا کی تمام نعمتیں اور مسرتیں حاصل ہوں۔

ارادت مند

خواجہ احمد فاروقی

صدق جدید۔ لکھنؤ۔ ۲۲ نومبر ۸۷ء

عزیز مکرم سلام مسنون

سید صباح الدین عبد الرحمٰن مرحوم کے سانحہ کے بارے میں سمجھ میں نہیں آتا کہ کن الفاظ میں تعزیت کروں۔ سانحہ سے چند ہی روز قبل ندوہ میں ان سے مفصل ملاقات ہوئی تھی، کیا معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے اور وہ چند ہی روز میں ناگہانی سفر آخرت پر روانہ ہونے والے ہیں۔ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نازک وقت میں دار المصنفین کی حفاظت کرے مرحوم کے صاحبزادہ ڈاکٹر احتشام کے صحیح پتہ سے آگاہ کیجئے تاکہ انھیں تعزیتی خط لکھوں۔

آپ کے غم میں شریک۔ عبد القوی

---

[1] خواجہ صاحب کی یہ خورد نوازی اور حوصلہ افزائی ہے، کاش ان کے جیسی دو چار سطریں لکھنا مجھے بھی آجاتا۔

مطبوعات جدیدہ

اسلام کی بنیادی تعلیمات: مرتبہ میر واعظ کشمیر مولانا محمد فاروق صاحب متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔ صفحات ۴۰۴ مجلد، قیمت ۵۰ روپے، پتے (۱) ادارۂ تصنیف و تالیف، میر واعظ منزل، سری نگر (۲) ربانی بک ڈپو، لال کنواں۔ دہلی۔ (۳) ادارۂ علم و حکمت، دیوبند۔ یو۔ پی۔

موجودہ میر واعظ کشمیر مولانا محمد فاروق صاحب کشمیر کی مختلف علمی و دینی انجمنوں کے مربی اور کم سنی ہی سے میر واعظ کے منصب پر فائز ہیں۔ اب کشمیر کی طرح ملک کے دوسرے علاقے بھی ان کی علمی و عملی سرگرمیوں کے دائرہ میں شامل ہو گئے ہیں، اور ہندوستانی مسلمانوں کی ملی و اجتماعی جد و جہد میں مختلف دینی و ملی رہنماؤں کے دوش بدوش وہ بھی حصہ لے رہے ہیں، اور ہر جگہ کے لوگ ان کی تقریروں سے فیضیاب ہو رہے ہیں، چند برس پہلے ان کی تقریروں کا ایک مفید مجموعہ "اسلام کا آفاقی پیغام" کے نام سے چھپا تھا، اور اب ان کے مواعظ و خطبات کا یہ دوسرا مجموعہ شائع ہوا ہے، اس میں انھوں نے اسلام کے بنیادی ارکان و عقائد کو اپنا موضوع بنایا ہے، اور ان کی تعبیر و تشریح پیش کی ہے، یہ مجموعہ دراصل صحیح مسلم کی اس مشہور حدیث کی شرح و توضیح پر مشتمل ہے، جو حدیث جبرئیلؑ کہلاتی ہے۔ اور جس میں اسلامؔ، ایمانؔ، احسانؔ اور قیامت کے بارے میں حضرت جبرئیلؑ کے سوال اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا تذکرہ ہے، پہلے یہ مکمل حدیث مع ترجمہ نقل کی گئی ہے، پھر امام مسلمؒ ان کی صحیح، حدیث کی

دینی حیثیت اور زیر بحث روایت کے راوی حضرت عمرؓ کے متعلق مختصر نوٹ تحریر کیا ہے۔ اس کے بعد حدیث میں بیان کئے گئے، امور کے مختلف پہلوؤں کی دلنشین تشریح کی گئی ہے، جس میں پہلے توحید کی حقیقت بیان کی ہے، اور اسی کے ضمن میں شرک اور اس کی بعض قسموں کا ذکر بھی کیا گیا ہے، پھر نبوت کی ضرورت و اہمیت اور ختم نبوت پر گفتگو کی ہے، اس کے بعد اسلامی ارکان نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کی فضیلت و اہمیت، ان کے حکم و مصالح اور بقدر ضرورت فقہی احکام و مسائل بیان کیے ہیں، نماز کے ذیل میں اذان، جمعہ، عیدین، صدقۂ فطر اور قربانی کے فضائل احکام اور مصالح بھی لکھے ہیں، اور جمعہ و عیدین کے خطبے بھی نقل کیے ہیں، روزہ کے ضمن میں اعتکاف اور شب قدر کا اور حج کے سلسلہ میں عمرہ اور خطبۃ حجۃ الوداع کا ذکر بھی ہے، پھر متعدد مسنون و مندوب نمازوں کے بارہ میں احکام تحریر کئے ہیں، نماز جنازہ کے سلسلہ میں میت کی تجہیز و تکفین کے مسائل بھی درج ہیں، موت کی مناسبت سے پیدائش، عقیقہ، ختنہ اور بچوں کی تربیت و تعلیم کے مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں، اس کے بعد نکاح، خطبۂ نکاح اور طلاق کے متعلق اسلامی تعلیم پیش کی گئی ہے اور مسجد کے آداب و فضائل بتائے گئے ہیں، نیز وضو، غسل، تیمم اور مسح کے احکام قلمبند کئے ہیں، اسلام کے بعد ایمان کی حقیقت پر بحث کی ہے اور دونوں کے فرق و مناسبت کو واضح کیا ہے، پھر ایمان کے اجزا یعنی اللہ، ملائکہ، رسولوں کتابوں، یوم آخرت، اور تقدیر پر ایمان کی تشریح کی گئی ہے، اس کے بعد احسان کی حقیقت واضح کی ہے۔ اور قیامت اور اسکے متعلقات و علامات پر بحث کی ہے، آخر میں اسلامی عقائد اور اہم تعلیمات کا خلاصہ دیا ہے۔ اور کشمیر میں اسلام کی دعوت و اشاعت کے مرکز جامع مسجد سری نگر کی مختصر قدیم تاریخ، موجودہ حالت اور اسکی مرکزیت و اہمیت دکھائی ہے، اور کشمیر کے کئی قدیم اور اہم دینی بزرگوں اور مبلغین کا مختصر حال تحریر کیا ہے، اس طرح یہ کتاب گوناگوں مفید دینی احکام و تعلیمات کا مجموعہ ہے، اس سے

اسلامی اصول کے مطابق زندگی گزارنے میں رہنمائی ملتی ہے، اس میں اسلام کے جن بنیادی ارکان اور اجزائے ایمان کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان سے ہر مسلمان کا واقف ہونا ضروری ہے، زیادہ نازک علمی و فنی بحثوں اور دقیق مسائل سے تعرض نہ کئے جانے اور سہل، سادہ اور سلیس زبان اور موثر پیرایہ بیان اختیار کئے جانے کی وجہ سے معمولی اور کم استعداد کے لوگ بھی اس سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مکتوبات عالیہ:۔ مترجمہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۶۲ مجلد، قیمت ۲۵ روپے، پتہ ادارہ مطبوعات مدرسہ نور محمدیہ، جھنجھانہ، ضلع مظفر نگر۔ یو۔پی

حضرت شاہ عبدالرزاق علوی قادری جھنجھانوی اپنے عہد کے نامور صوفی بزرگ تھے، ڈاکٹر تنویر احمد علوی کو ان کی ذات اور تصنیفات سے بڑی دلچسپی اور مناسبت ہے، اس سے پہلے وہ انکی تصنیف "صحائف معرفت" اور "ملفوظات رزاقیہ" کے علاوہ ان کے حالات و سوانح سے متعلق ایک تصنیف "خیر البیان" کا اردو ترجمہ کر چکے ہیں، اور اب علالت و معذوری کے باوجود انھوں نے شاہ صاحب کے مکتوبات کا یہ مجموعہ اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، یہ مجموعہ بھاگلپور (بہار) کے کتب خانہ خانقاہ پیر دمڑیا بابا میں موجود تھا جو انھیں جناب سید شاہ منظر حسین صاحب بھاگلپوری کے توسط سے دستیاب ہوا تھا، یہ چوبیس (۲۴) خطوط پر مشتمل ہے، پہلے اصل فارسی متن شائع کیا گیا ہے، پھر اس کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے جو سلیس اور شستہ ہے، مگر خطوط عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہیں، ان میں صوفیانہ حقائق، وحدۃ الوجود کے دقائق اور سلوک کے اسرار وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے، جن سے سلوک و تصوف کے لذت شناس ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اس نایاب کتاب کی دریافت اور اس کے ترجمہ کی اشاعت پر مترجم اور شاہ منظر حسین صوفیانہ ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے شکریے کے مستحق ہیں۔

پیام اقبال: مرتبہ جناب محمد بدیع الزماں صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۴۰ روپے، پتہ بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ وغیرہ۔

جناب محمد بدیع الزماں ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پھلواری کو ڈاکٹر اقبال کی شاعری سے بڑی دلچسپی ہے اور وہ ایک عرصہ سے اس کے مطالعہ میں مشغول ہیں، یہ کتاب اقبال کے فکر و فن پر سولہ مضامین کا مجموعہ ہے، اس کی ابتدا اقبال کے نظریہ شاعری اور خاتمہ ان کے نظریہ تصوف پر ہوا ہے، پہلے میں بتایا ہے کہ اقبال سے اردو شاعری میں نئے دور کا آغاز ہوا، اور اس میں بلند آہنگی اور بلندی فکر پیدا ہوئی، اقبال نے شاعری کو پیغامبری کا درجہ دے کر کوہ طور پر ہمکلامی کے لیے تیار کیا بلکہ ع یا دامن یزداں چاک یا اپنا گریباں چاک کی ترغیب دی، اقبال کے تصوف کو ترک کے بجائے مستی کردار سے عبارت بتایا ہے، اس میں معجزات و کرامات کے بجائے زندگی اور گوہر زندگی کو تلاش کیا ہے، دوسرے مضامین میں خودی، وطنیت ساقی، انقلاب، حسن و عشق، عمل، طنز، مناجات، خواتین اور شاہین کے بارے میں اقبال کے افکار و تصورات کو نمایاں کرکے اقبال کا کمال و امتیاز دکھایا ہے، ایک مضمون میں اقبال کے خطوط کی روشنی میں ان کے کلام کے چند اہم نکتوں کی وضاحت کی ہے، تین مضامین میں اقبال کے کلام کا فنی حیثیت سے جائزہ لیا ہے۔ پہلے میں ان کے الفاظ کی طلسم آفرینی پر گفتگو کی ہے، اور بتایا ہے کہ الفاظ کے معاملہ میں انکے نظریات انکے نظریہ شاعری ہی سے ہم آہنگ تھے، انھوں نے روایتی الفاظ کو جو اپنی تازگی ختم کر چکے تھے نئے معنی پہنا کر ان کو وسعت و اثر بھی بخشا اور نئے الفاظ وضع کرکے ان کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بھی بنایا، مصنف نے الفاظ کے معاملہ میں اقبال کی دس خصوصیتیں بیان کی ہیں، دوسرے فنی مقالہ میں روایتی اور مروجہ تشبیہات و استعارات کو نئے معنی پہنانے کا ذکر کیا ہے، تیسرے میں اقبال کی شاعرانہ مصوری و پیکر تراشی کے کمالات دکھائے ہیں، اقبال پر بہت لکھا گیا ہے مگر اچھا لکھنے والے پرانے زمین میں بھی نئے گل بوٹے کھلا دیتے ہیں، اس کی مثال یہ کتاب بھی ہے جو اقبال کی بے کم و کاست ترجمانی کی ہے، انکی محنت و کاوش قدر کے لائق ہے، کہیں کہیں زبان و املا کی غلطیاں بھی ہیں جیسے "جو کسی دوسرے شعرا کے یہاں نہیں ملتا" (ص ۱۰)، "ماحول کے طابع رہیں گے" (ص ۱۲۳)، لاپچ کی جمع لانچیں (ص ۱۹۳ و ۱۹۶) بھی ذوق پر گراں گزرتی ہے۔

"ض"

جلد ۱۴۱ ماہ رجب المرجب ۱۴۰۸ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۸۸ء عدد ۳

مضامین

شذرات	ضیاء الدین اصلاحی	۱۶۲ - ۱۶۴

مقالات

اندلس کا اسلامی تمدن مستشرقین کی نظر میں	ڈاکٹر مصطفیٰ الشکعۃ صدر دراسات علیا و بحث علمی جامعہ امارات عربیہ (ترجمہ محمد عارف اعظمی عمری رفیق دار المصنفین)	۱۶۵ - ۱۸۱
امام بخاریؒ کی التاریخ الکبیر اور اس سے متعلق کتابیں	مولانا قاضی اطہر مبارکپوری سابق ایڈیٹر البلاغ بمبئی	۱۸۲ - ۲۰۳
نائیجریا میں تحریک جہاد اور نصب خلافت	ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی پروفیسر و صدر شعبۂ عربی کالی کٹ یونیورسٹی کیرالا	۲۰۴ - ۲۱۲
دار المصنفین کی تاریخ کا تیسرا دور	پروفیسر عبد اللہ عباس ندوی سابق استاذ ام القریٰ یونیورسٹی مکہ و معتمد تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء	۲۱۳ - ۲۱۹
سید صباح الدین عبد الرحمن صاحبؒ کی وفات پر تعزیتی خطوط		۲۲۰ - ۲۳۴

ادبیات

حمد	جناب فضا ابن فیضی صاحب مئو	۲۳۵ -
رباعیات	جناب علقمہ شبلی صاحب کلکتہ	۲۳۶
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۲۳۷ - ۲۴۰